جھیل میں لاش

جاسوسی دائرہ سیریز

جھیل میں لاش

اکرم الہ آبادی

Akram Allahabadi

فرحت پبلیکیشنز۔ممبئی۔انڈیا

جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ ہیں

اس ناول میں شائع ہونے والے تمام واقعات،
مقامات و کردار فرضی ہیں۔اس سے کسی طرح
کی مطابقت محض اتفاقیہ ہے۔جس کی مصنف،
پبلشر و پرنٹر پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

اس ناول کی دوبارہ اشاعت، ترجمے یا کسی اور مقصد سے استعمال کے
لئے پبلشر کی تحریری اجازت ضروری ہے ورنہ قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔

پرنٹر:۔۔۔۔۔ممبئی۔انڈیا

Akram Allahabadi

سڑی ہوئی لاش

لاش ہوا بھرے ہوئے غبارے کی طرح پھول گئی تھی۔

اور تمام پولیس آفیسر اپنی ناکوں پر رومال لگائے اس سے دو قدم دور کھڑے ہو کر اس کا معائنہ کر رہے تھے۔

''اس کا پوسٹ مارٹم ہونا ناممکن ہے۔'' سول سرجن ڈاکٹر سریواستو نے کہا۔''بلکہ اسے تو یہاں زیادہ دیر رکھنے کی اجازت بھی نہ دوں گا۔''

''کیا اس کے شناخت کیے جانے کا کوئی امکان ہے، مسٹر خان؟'' ڈپٹی کمشنر آف پولیس نے محکمہ سراغ رسانی کے انچارج سپرنٹنڈنٹ خان کی طرف گھوم کر پوچھا۔

''صرف اس قدر کہ یہ ایک عورت تھی، جوان، گورے رنگ کی۔'' خان نے لاش کو گھورتے ہوئے کہا۔

''اور شاید خوبصورت بھی۔'' پیچھے سے سارجنٹ بالے کی دبی ہوئی آواز سنائی دی۔

''یہ نظریہ آپ نے کیسے قائم کر لیا؟'' کمشنر نے سنجیدگی سے بالے کی طرف رخ کر کے پوچھا اور سارجنٹ بالے کی روح فنا ہو گئی۔ کمشنر قطعی سنجیدہ تھا۔

''جی...وہ...میرا مطلب ہے کہ اس کے چہرے کے نقوش۔'' بالے ہچکچانے لگا۔

''میں بھی ان کے خیال سے متفق ہوں۔'' خان نے جلدی سے بات سنبھال لی اور بالے کی جان میں جان آئی۔

''لڑکی زیادہ سے زیادہ ۲۰۔۲۱ سال کی ہو گی۔'' وہ پھر بولا۔''اور مچھلیاں اسے نوچ نہ ڈالتیں تو آپ بھی یہی کہتے۔''

''اوہ، یس۔'' سول سرجن نے تائید کی۔''یہی عمر ہو گی۔''

Akram Allahabadi

''کیا اسے مردہ گھر میں نہیں رکھا جا سکتا؟'' سی پی نے پھر ڈاکٹر سے پوچھا۔

''اس کیفیت میں غلط سی چیز ہوگی۔'' ڈاکٹر بولا۔

''بہتر ہے، ڈسپوز آف کرا دیجیے۔'' یہ کہہ کر سی پی پوسٹ مارٹم تھیٹر کی عمارت سے باہر نکل آیا۔

لاش کے فوٹو وغیرہ پولیس فوٹو گرافرز پہلے ہی لے چکے تھے۔ اس لیے ڈاکٹر سریواستوا نے اپنے اسسٹنٹ کو اشارہ کر دیا کہ وہ لاش کو سرکاری طور پر دفن کرنے والے اسپتال کے اسٹاف کے سپرد کر دے۔ پھر وہ بھی عمارت سے باہر نکل آیا۔

''آپ کا کیا خیال، یہ خودکشی ہے یا مرڈر؟'' پولیس کمشنر سوچتے سوچتے خان کی طرف گھوم پڑا۔

''ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر وہ پھول نہ گئی ہوتی تو شاید اس کی تحقیق کی جا سکتی، ویسے میں چند دنوں میں اس کا جواب دے سکوں گا۔'' خان نے مؤدب لہجے میں جواب دیا۔

''مجھے بہر حال اس لاش سے اتنا سروکار نہیں جس قدر مجھے اس کے نتائج کی فکر ہو رہی ہے۔'' پولیس کمشنر اپنی لمبی سیاہ رنگ کی بیوک میں بیٹھتے ہوئے خان سے بولا۔ خان بالے کو اشارہ کر چکا تھا کہ اس کی کار بالے ہی ڈرائیو کرے لائے۔ وہ خود پولیس کمشنر کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ڈپٹی انسپکٹر مسٹر شاہ اور انسپکٹر ڈیسوزا بھی اسی کار میں بیٹھ گئے تھے۔

''کیسے نتائج؟'' خان نے پوچھا۔

''جن کے خیال سے اس کے معائنے کے لیے مجھے خود آنا پڑا۔ یہ لاش ڈونگرا جھیل میں پائی گئی ہے اور شہر کے مغربی حصے کی آبادی کو اسی جھیل سے پانی سپلائی کیا جاتا ہے۔'' پولیس کمشنر نے کار کی چھت کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ کا اندیشہ بے جا نہیں۔ ایک سڑی لاش کے جراثیم پوری جھیل کا پانی گندا کر سکتے ہیں۔'' خان نے تائید کی۔

Akram Allahabadi

''اور یہ گندگی ہزاروں انسانوں کی زندگی خطرے میں ڈال سکتی ہے۔'' کمشنر بڑبڑایا۔

''لیکن یہ پانی تو فلٹر ہوکر آتا ہے۔'' ڈی سی پی نے کچھ سوچ کر کہا۔

''اس کا بہتر جواب تو آج رات تک کے حالات دیں گے، لیکن میرا خیال ہے کہ فلٹریشن کے باوجود ان جراثیم کو نہیں روکا جا سکتا جو شہر میں مہلک سے مہلک بیماریاں لا سکتے ہیں۔'' کمشنر نے کہا۔

''یہ تو عجیب معاملہ ہوگیا۔'' ڈی سی پی نے سہمے ہوئے سے لہجے میں کہا۔

''ہاں۔ کسی احمق کے بچے نے اپنا جرم چھپانے کے لیے اس لاش کو وہاں ڈال کر ہزاروں شہریوں کی زندگی خطرے میں ڈال دی۔'' کمشنر تقریباً دانت پیسنے لگا۔ اس وقت وہ جذباتی طور پر غضبناک ہو رہا تھا۔ بارعب شخصیت کا یہ گرانڈیل آدمی جو پولیس جیسے سخت گیر محکمے کا افسرِ اعلیٰ ہوتے ہوئے بھی بہت نرم مزاج، خلیق اور ہنس مکھ واقع ہوا تھا، اس وقت خلافِ معمول غصے و جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کے ماتحتوں نے اسے اس کیفیت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''میں اس بے وقوف مجرم کو بدترین سزا دلانے کی کوشش کرونگا۔'' وہ آپ سے آپ ہی گرم ہوتا گیا۔

''اگر یہ خودکشی کا کیس نہ ہوا تو۔'' خان نے اس کی ذہنی رو کو شبہات کے دوسرے پہلو پر موڑنے کی کشش کی اور وہ اس میں کامیاب رہا۔ پولیس کمشنر کا موڈ اس خیال کے اثر انداز ہوتے ہی اعتدال پر آگیا۔

''ہمیں بہرحال اس مرڈر سے زیادہ اس کے نتائج پر توجہ دینی چاہیے۔'' ڈی سی پی نے اظہارِ خیال کیا۔

''آپ اطمینان رکھیں، جہاں تک اس لاش کا تعلق ہے میں ایک ہفتے میں حقائق کا

سراغ لگا لونگا۔'' خان نے وعدہ کیا۔

''ویسے جھیل کے پانی میں پھیلنے والے اس کے مہلک اثرات کو روکنا بھی پولیس کے بس کا روگ نہیں ۔یہ کام میونسپل کارپوریشن کے محکمہ صحتِ عامہ اور واٹر سپلائی کے اس جھیل کے انچارج ہائیڈرالک انجینئر کا ہے، لیکن ہمیں پبلک میں پھیلنے والی بے چینی کو دبانے کو کوئی موثر طریقہ سوچنا پڑے گا۔'' کمشنر نے کہا۔

''بشرطیکہ واٹر ورکس والے یہ یقین دلا دیں کہ وہ جراثیم کش دواؤں کے ذریعے آب رسانی کی پائپ لائنوں میں ہی خطرات کے امکان کو ختم کر دیں گے۔'' خان نے لقمہ دیا۔

''یہ وہ ہم سے بہتر جان سکتے ہیں اور ڈیوٹی بھی ان کی ہی ہے۔'' کمشنر نے کہا۔

''تو پھر آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔ممکن ہے کہ یہ کیس مجرمانہ نہ ہو اور لڑکی نے خودکشی ہی کی ہو۔'' ڈپٹی کمشنر نے کمشنر کو مطمئن کرنا چاہا۔

''میں اس لیے نہیں پریشان ہو رہا کہ تعلق ہمارا ہے یا نہیں ۔اور اگر یہ کوئی واردات قتل بھی ہو، تب بھی پولیس کو علمِ غیب نہیں ہوتا کہ وہ کسی جرم کے سرزد ہونے سے پہلے ہی اس کا انسداد کر لے ۔مجھے تو صرف یہ احساس ہے کہ کہیں یہ متعفن لاش دوسروں کے لیے نقصان دہ نہ ثابت ۔'' کمشنر نے یہ کہہ کر رخ باہر کی طرف کر لیا۔

وہ موسمِ گرما کی تیز دوپہر میں دھوپ سے تپتی ہوئی سڑک پر دوڑتی ہوئی اس کار کے اندرونی حبس سے گھبرا گیا تھا۔اس نے تازہ ہوا کی ایک لمبی سانس کھینچی اور پھر کسی خیال میں کھو گیا، ڈی سی پی اپنی انگلیوں کے ناخنوں کے بڑھنے پر فکرمند ہونے لگا اور خان یہ سوچ رہا تھا کہ اگر جھیل ڈونگرا میں پائی جانے والی اس بدبودار سڑی ہوئی لاش کی خبر پبلک میں پھیلی تو کمزور دل و دماغ کے توہم پرست عوام پر اس کا کیا ردِعمل ہوگا۔ممکن ہے بہت سے اس پانی کو چھونا بھی پسند نہ کریں، بہت سے اسے پینے کے بعد اس خبر کو سن کر محض وہم سے بیمار ہو جائیں اور شاید انھیں اس کی پیدا کردہ کوئی بیماری ہی لگ جائے۔

Akram Allahabadi

''میری ایک تجویز ہے، اگر آپ اجازت دیں۔'' وہ کمشنر سے مخاطب ہوا۔

''ہاں ہاں، کہیے۔'' کمشنر کھڑکی سے سر اندر کر کے اس کی طرف مخاطب ہو گیا۔

ڈی سی پی نے تھکے ہوئے انداز میں کاندھے سکوڑے اور دونوں کے درمیان میں تھکے ہوئے نشست کی پشت سے ٹک گیا تا کہ وہ دونوں آسانی سے گفتگو کر سکیں۔

''عوام تک اس خبر کو نہ پہنچنے دیا جائے، ورنہ اس کا ردِ عمل اچھا نہ ہوگا۔'' خان بولا۔

''میں بھی اس سے متفق ہوں اور آپ کو یہی ہدایت دینے والا تھا۔'' کمشنر نے ڈی سی پی کی طرف ایک نظر دیکھ کر جواب دیا۔

''لیکن واٹر ورکس یا صحتِ عامہ کا محکمہ؟'' ڈی سی پی بول اٹھا۔

''یہ ان کی بدنامی کا معاملہ ہے اس لیے وہ ہم سے زیادہ رازداری برتیں گے، ورنہ پبلک ان کو ہی الزام دے گی کہ اس جھیل پر جس کا پانی لوگ پیتے ہیں ایسے انتظامات کیوں نہیں رکھے گئے جس سے اس واقعہ کی نوبت نہ آتی۔'' کمشنر کی بجائے خان نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' کمشنر یہ کہہ کر خاموش ہو گیا اور ڈی سی پی اور خان دونوں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے کہ اب وہ مزید گفتگو کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆☆

''ملاحظہ ہو، یہ رہی آپ کی رازداری۔''

سارجنٹ نے شام کے چار مقامی اخبار خان کے سامنے میز پر ڈال دیے۔ خان کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ ان اخباروں کی بڑی سرخیوں نے اسے بری طرح چونکا دیا۔ پہلے اخبار 'دی ایوننگز' کی سرخی تھی:

''شہر کو سڑی لاش کا پانی سپلائی کیا جا رہا ہے۔''

دوسرے اخبار 'ایوننگ اسٹینڈرڈ' کی شہ سرخی تھی:

''جھیل ڈونگرا میں سڑی ہوئی لاش پائی گئی محکمہ واٹر سپلائی کے احکام کی غفلت کو

ثبوت۔"

تیسرے اخبار 'شام بمبئی' کی شاہ سرخی تھی:

"ایک پراسرار لاش ڈونگرا جھیل میں سڑتی رہی۔"

چوتھے اخبار 'نو یگ ویوس' کی شاہ سرخی تھی:

"شہر میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے...یہ بدبودار پانی کیسا ہے؟"

اوران سرخیوں کے ضمن میں جھیل میں پائی جانے والی سڑی لاش کی پوری رپورٹ کے علاوہ شہری ردِعمل بھی درج تھا۔مقامی رپورٹوں نے خبر دی تھی کہ کل رات سے ہی شہر کے مغربی علاقوں میں نلوں میں آنے والا پانی بدبودار اور میلا پایا جارہا ہے اور عام طور پر محسوس کیا جارہا ہے کہ صحتِ عامہ کے لیے یہ ضرور کسی خطرے کا پیش خیمہ ہے۔

ایوننگ اسٹینڈرڈ نے تو ایک ضمنی سرخی میں یہ بھی لکھ مارا تھا کہ عام طور پر پانی میں پائے جانے والے خلیوں کے علاوہ آج شہر کے مغربی علاقے کے پانی میں بہت باریک چھوٹے کیڑے رینگتے دیکھے گئے ہیں۔اور عام خیال یہ پایا جارہا ہے کہ کہیں اس گندے پانی سے ہیضے وغیرہ جیسی مہلک اور پھیلنے والی بیماریاں نہ پھوٹ پڑیں۔لیکن خبروں میں اخبار والوں نے عوام کا حوالہ دے کر سب سے کڑی تنقید جھیل ڈونگرا کے ہائیڈ رولک انجینئر پر کی تھی۔پھر پورے محکمۂ واٹر سپلائی اور محکمہ صحتِ عامہ کی خبر لے ڈالی گئی تھی۔اخبار والے اس لیے اور چڑ گئے تھے کہ احتیاطی تدابیر کے طور پر محکمۂ صحت اور محکمہ آب رسانی نے اس خبر کو دبانا چاہا تھا اور پریس والوں کو اس سلسلے میں کوئی بیان دینے سے انکار کردیا تھا۔شاید وہ بھول گئے تھے کہ پریس والوں سے اس قسم کے راز کا چھپالینا ناممکن تھا اور اس سلسلے میں برتی جانے والی رازداری خود ان محکموں کے لیے خطرناک تھی، کیونکہ اخبارات کسی کے پابند نہیں ہوتے، لیکن شکر تھا کہ اس سلسلے میں کسی اخبار نے پولیس کی خبر نہیں لی تھی۔صرف یہ لکھا تھا کہ لاش کس کی تھی؟ اور موت کس طرح واقع ہوئی؟ اس کی تفصیلات ابھی معلوم نہیں ہوسکی ہیں، کیونکہ پولیس خود ابھی کسی

Akram Allahabadi

نتیجے پر نہیں پہنچ سکی ہے۔

اخبارات کو میز پر پھینکتے ہوئے خان ایک لمبی سرد سانس کھینچ کر صوفے کی پشت سے ٹک گیا۔

''محض ایک لاش نے سارے شہر کا ناطقہ بند کر دیا ہے۔'' بالے نے کہنا شروع کیا۔

''کیوں؟ کیا راؤنڈ لگا کر آرہے ہو؟''

''بالکل۔''

''کیا دیکھا؟''

''ہر طرف وہی چرچے۔ بہت سے لوگوں کو تو میں نے کھڑے کھڑے منہ بگاڑ بگاڑ کر تھوکتے دیکھا ہے۔ بہت سے زبردستی کی قے کرنے کی کوشش کرتے نظر آئے۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کافی گڑبڑ ہے؟''

''مطلب وطلب کے چکر میں واٹر ورکس والے پڑیں، اپنا تو دامن صاف ہے۔''

''کیوں؟''

''اسے خودکشی قرار دیا جا سکتا ہے۔''

''کل تم تمام مرڈر کیسز کو بھی خودکشی قرار دینے لگو گے۔''

''خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔''

''مجھے نکما پن قطعی پسند نہیں ہے۔''

''غالب کا وہ شعر ہے...''

''شٹ اپ۔''

''میری توہین نہیں ہوئی، یہ چچا غالب...''

''میں تمہارا بھیجہ ٹھکانے کر دونگا، یہ بکواس کا موقع ہے؟''

''خاکسار روتے رہنے کے قائل نہیں۔ جو ہوگی، بھگت لیں گے۔''

Akram Allahabadi

لیکن خان کوئی جواب دینے کی بجائے اٹھ کر ٹیلی فون اسٹینڈ پر چلا آیا۔اس نے نمبر ڈائل کیےاور جواب کا انتظار کرنے لگا۔

''آپ شاید مہلک جراثیم کی گرفتاری کا حکم صادر فرما رہے ہیں۔''

''چپ بیٹھو۔''خان نے اسے ڈانٹا۔

''جی، کیا فرمایا آپ نے؟''دوسری طرف فون کا رسیور اٹھانے والے نے حیرت سے پوچھا۔

''اوہ،آپ نہیں، میں یہاں ایک احمق کو ڈانٹ رہا ہوں۔''

''سبحان اللہ،ایک بار اور ڈانٹیے۔''

''ہیلو۔''خان نے بالے کی طرف دھیان نہ دے کر فون کرنے والے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''میں انسپکٹر کھاڈلکر بول رہا ہوں، جناب۔''وہ بولا۔

''ذرا ایس پی سالومن صاحب کو بلایئے۔''

''ابھی،ایک منٹ۔''یہ کہہ کر وہ فون رکھ کر چلا گیا۔چند سیکنڈ بعد رسیور اٹھانے والا خود سپرنٹنڈنٹ سالومن تھا۔

''ہیلو،ایس پی سالومن آف آرمڈ پولیس اسپیکنگ۔''

''میں خان بول رہا ہوں،سالومن صاحب۔''

''اوہ،بھئی بہت دن بعد بولے آپ۔''

''شکایتیں پھر کسی وقت،اس وقت ایک ایمرجنسی ہے۔''

''کیوں؟ کیا ہوا؟''سالومن نے گھبرا کر پوچھا۔''شہر میں کچھ گڑبڑ ہوگئی کیا؟''اس نے سوال کیا۔

دراصل مسلح پولیس سے کام لینے کی ضرورت اسی وقت پیش آتی تھی جب شہر میں

وسیع پیمانے پر پولیس کے انتظامات کرتے ہوئے یا فساد وغیرہ کا اندیشہ ہوتا، یا کسی خارجی مہمان کے بڑے پیمانے پر استقبال کرنے کی تیاریاں کی جاتیں، لیکن آج تو کوئی ایسی خبر شہر سے نہیں سنی گئی تھی۔ ایس پی سالومن کو اسی لیے چونکنا پڑا۔

''دراصل بات تو معمولی سی تھی، محض ایک خودکشی یا مرڈر، لیکن اس کے نتائج بڑے خراب مرتب ہو رہے ہیں۔''

''آپ ڈونگرا جھیل والی لاش کا تو ذکر نہیں کر رہے؟ میں نے ابھی شام کے اخباروں میں دیکھا ہے۔'' سالومن نے پوچھا۔

''ہاں وہی، لیکن عوام میں بڑا ہیجان پھیلا ہوا ہے اور میرا خیال ہے کہ شدید قسم کے اعتراضات سے بچنے کے لیے اور کسی حد تک عوام کو مطمئن کرنے کے لیے یہ اقدام کرنا ہی پڑے گا۔''

''کیسا اقدام؟''

''میں چاہتا ہوں کہ ابھی اسی وقت ڈونگرا جھیل پر چاروں طرف مسلح پولیس کا ۲۴ گھنٹوں کا پہرہ قائم کرنے کے لیے آپ آرڈ کانسٹیبلری کے دو دستے بھیج دیں۔'' خان نے کہا۔

''ابھی؟'' سالومن نے تذبذب کے انداز میں کہا۔ ''لیکن کمانڈنٹ؟''

''اس کا ذمے دار میں ہوں۔ میں بعد میں کمشنر سے رکوزیشن آرڈر نکلوا کر بھیج دونگا۔''

''تو میں اس مطالبے کو برائے کمشنر درج کروں؟''

''ہاں ہاں، ٹھیک ہوگا۔''

''بھیجے جانے والے دستوں کے لیے کوئی خاص ہدایت؟''

''کسی غیر سرکاری، غیر ذمے دار آدمی کو جھیل تک نہ پہنچنے دیں۔ باقی ہدایات بعد

میں میں وائرلیس پر جاری کر دونگا۔'' خان نے کہا۔

''او کے۔'' سالومن فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

''اچھا، باقی آئندہ۔''

''کیا؟''

''باتیں۔''

''اوہ، اچھا، بائی بائی۔''

سالومن نے رسیور رکھ دیا اور خان نے بھی۔

''سوت نہ کپاس، کولھو سے لٹھم لٹھا۔'' خان کی پلٹتے دیکھ کر بالے بڑبڑایا۔

''یہ لٹھ بعد میں چلانا، پہلے تم ہیڈ کوارٹر جا کر گمشدہ لڑکیوں کی فائل لیتے آؤ اور کیٹلاگ بھی۔''

''آپ مجھے ٹالنا چاہتے ہیں، ورنہ یہ چیزیں فون سے بھی طلب کی جا سکتی ہیں۔''

''میں کچھ وقفے کے لیے ذہنی سکون چاہتا ہوں۔ تم اس طرح شہر کی کیفیت کو بھی جائزہ لیتے آؤ گے۔'' خان نے نرم لہجے میں کہا اور بالے سمجھ گیا کہ اس وقت خان کا موڈ واقعی تخلیہ پسندی کا ہے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

بنگلے کے دروازے پر ہی دونوں کی ٹکر ہوگئی۔ قصور یا تو بالے کا تھا یا رؤف کا، بہر حال دونوں کسی دھن میں کھوئے ہوئے تھے۔

''خدا نے دو دو مونچھیں دی ہیں، پھر بھی دیکھ کر نہیں چلتے۔'' بالے نے رؤف کو گھور کر کہا۔ اور رؤف اس جملے پر چڑنے کی بجائے ہنس پڑا۔

''جھینپ مت مٹاؤ، رؤف بھائی۔ خان صاحب کو معلوم ہو گیا ہے کہ تم کسی کام کے آدمی نہیں ہو۔''

''کیا مطلب؟'' رؤف نے سنجیدگی سے پوچھا۔

Akram Allahabadi

''وہ کہہ رہے تھے کہ میں نے ہیڈ کوارٹرز میں فون کیا کہ رؤف کو گمشدہ لڑکیوں کی فائل اور کیٹلاگ لے کر بھیج دو اور بھائی حرام مونچھ ہیں کہ عین غین۔''

''میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' رؤف نے کسی موٹے بچے کی طرح منہ پھلا لیا۔

''آپ کوئی کنواری لونڈیا ہیں جو میں مذاق فرماؤنگا آپ سے۔'' بالے نے بھی منہ بنا کر جواب دیا۔

''یار آدمی ہو یا...؟''

''سارجنٹ بالے۔'' بالے نے بات کا

''جہنم میں جاؤ۔'' رؤف جھنجلا گیا۔

''وہ تو جاؤ گے ہی، لیکن ابھی سپرنٹنڈنٹ کے سامنے جانے کی تیاری کرو۔ بہت غصے میں ہیں۔''

''کیا واقعی فائل منگائی تھی؟''

''خدا جھوٹ نہ بلوائے۔''

''تو میں ابھی لے کر آتا ہوں۔''

''جلدی آنا، ورنہ صاحب کا ٹمپریچر تیز ہو جائے گا۔'' بالے نے اور زیادہ سنجیدگی اختیار کر لی۔

''بس، ٹیکسی پر گیا اور آیا۔''

رؤف یہ کہتا ہوا جواب کا انتظار کیے بغیر باہر نکل گیا۔ بالے نے اطمینان کا سانس لے کر دونوں ہاتھ جھٹکے اور اپنی موٹر سائیکل نکالنے چلا گیا۔ جب اسے کھلے بندوں شہر کا گشت کرنا ہوتا اور وہ اکیلا ہوتا تو موٹر سائیکل ہی سنبھالا کرتا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

شہر گیر سنسنی

جس وقت وہ ڈھیر بھائی مارکیٹ روڈ سے گزر رہا تھا، ایک بھیڑ نے اس کا راستہ روک دیا۔ سینکڑوں آدمی ایک ٹرک کو گھیرے کھڑے تھے۔ یہ محکمہ صحت عامہ کی وائرلیس وین تھی جس میں آگے پیچھے رخ کیے ہوئے دو لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے تھے جن پر کچھ اعلان کیا جا رہا تھا۔ بالے نے دونوں پیر زمین پر ٹیک کر جیب سے سگریٹ کیس نکالا اور سگریٹ سلگانے لگا۔

لاؤڈ اسپیکر سے قلیل وقفے کے بعد ایک موٹی سی بھدی آواز سنائی دی۔

''محکمہ صحت عامہ کی طرف سے اعلان کیا جاتا ہے کہ عوام کو ڈونگرا جھیل کے واقعہ سے پریشان نہ ہونا چاہیے۔ ہائیڈرالک انجینئر نے اس جھیل سے شہر کو سپلائی کیے جانے والے پانی میں جراثیم کش دوائیں چھڑکوا دی ہیں، جن سے پانی کچھ میلا اور خفیف سا بدبودار ضرور آئے گا، لیکن یہ کسی کے لیے نقصان دہ نہ ہوگا۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر پبلک کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ ابھی تین چار دنوں تک پینے کے پانی کا ابال کر استعمال کریں۔ عوام کو پھر آگاہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس واقعے سے کوئی شدید اثر نہ لیں۔ اس بات کے انتظامات کیے جا رہے ہیں کہ آئندہ کوئی ایسا ناخوشگوار واقعہ نہ ہو پائے۔''

اعلان کے بعد مجمع چھٹ گیا اور صحت عامہ کی وائرلیس وین آگے بڑھ گئی۔ بالے موٹر سائیکل ایک طرف کر کے عوامی چہ مگوئیاں سننے لگا۔ لوگ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر منتشر ہو رہے تھے۔ زیادہ تر لوگ اس اعلان سے غیر مطمئن ہی نظر آ رہے تھے اور کچھ لوگ بڑبڑاتے جا رہے تھے کہ پانی کا گھر گھر ابال کر پیا جانا اور وہ بھی گرمی کے موسم میں ٹیڑھی کھیر ہے، لیکن گالیوں کا طوفان اس وقت بھی دوست تھا، ایک تو واٹر ورکس کا جھیل ڈونگرا والا عملہ جس کی لاپرواہی سے اس واقعے کو تعبیر کیا جا رہا تھا اور دوسرا وہ گمنام قاتل جس نے اس لڑکی

Akram Allahabadi

کی لاش جھیل میں پھینکی ہوگی یا پھر خود وہ لڑکی جسے خودکشی کرنے کے جرم میں اور کوئی موزوں مقام ہی نہیں ملا تھا جو جھیل میں سڑ کر ہزاروں آدمیوں کی زندگی خطرے میں ڈال دیں۔ بالے کو مختلف مقامات پر یہ اعلانات سنائی دیے۔ سرکاری پبلسٹی وین بھی اس کام پر لگی ہوئی تھیں اور افواہوں نے سارے شہر میں سنسنی پھیلا رکھی تھی۔ ہوٹلوں میں گاہک ان کے منتظمین سے جھگڑ رہے تھے کہ پانی ابالا ہوا ہے یا یونہی چلایا جا رہا ہے۔ بعض لوگ فٹ پاتھوں کے کنارے قے کرتے بھی نظر آئے، شاید وہ بغیر ابلا پانی پی گئے تھے۔

بالے نے گاڑی پھر ایک کیفے کے سامنے روک لی۔ یہاں کیفے کے دروازے پر کافی بھیڑ لگی ہوئی تھی اور مجمع کے درمیان ایک جوان آدمی حیران و پریشان کھڑا ہوا تھا۔ اس کے کپڑے تمام پھٹ چکے تھے۔ سر کے بال بچے ہوئے تھے اور چہرے پر خراشیں پڑ گئی تھیں۔ مجمع اسے گھیرے ہوئے چیخ رہا تھا۔

''مارو سالے کو۔''

''کیا بات ہے؟'' بالے نے ایک آدمی کو اشارے سے بلا کر پوچھا۔ اور جواب دینے کے لیے ایک کی بجائے کئی ایک اس کی طرف پلٹ پڑے۔

''ارے لو۔'' پہلا آدمی بڑی بے تکلفی سے بولا۔ ''سالا گورنمنٹ کی اولاد کہتا ہے اس میں گورنمنٹ کا کوئی قصور نہیں۔ پبلک پانی کا ٹیکس کیا ان سرکاری یتیموں کو پالنے کے لیے دیتی ہے؟''

''مگر یہ ہے کون؟'' بالے نے پوچھا۔

''واٹر مین ہے، سور کا بچہ۔ پانی کی لائن کھولنے آیا تو اوپر سے بولتا ہے، 'پینے کا ہے تو پیو نہیں تو پیاسے مرو۔'' دوسرے نے جواب دیا۔

بالے نے ان کی طرف سے توجہ ہٹا کر دیکھا تو والو مین (valve man) بڑی بے بسی سے اس کی ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجمع کا اشتعال اب بھی سرد نہیں ہوا تھا۔ بالے نے

موٹر سائیکل وہیں ٹکا دی اور اتر کر مجمع کو چیرتا ہوا والومین کی تک پہنچ گیا۔ وہ اس کے اور مجمع کے درمیان کھڑے ہو کر مجمع کی طرف پلٹ گیا۔ بہت سی نگاہیں اس کو گھور رہی تھیں، لیکن وہ اس سے مرعوب نظر آ رہے تھے۔

''آپ لوگ شریف اور باعزت شہری ہیں۔ آپ کو قانون اپنے ہاتھ میں نہ لینا چاہیے۔'' بالے نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

''ہاتھ میں کیا ہم تو جوتے کی ٹھوکر میں اڑا دیں گے۔ قانون وانون کی ایسی کی تیسی۔'' مجمع سے ایک جوشیلی آواز سنائی دی۔

''کون صاحب ہیں؟'' بالے نے ایڑیوں کے بل اونچا ہو کر دیکھا۔ ایک تندرست سا سیاہ فام آدمی چند آدمیوں کے پیچھے اکڑا کھڑا ہوا تھا۔ بالے آہستگی سے آگے بڑھا اور دونوں ہاتھوں سے اس نے سامنے والے آدمیوں کو دو طرف ہٹا دیا، دوسرے لمحے اس آدمی کا گریبان بالے کے ہاتھ میں تھا۔

''ارے، یہ دادا ہے اس محلے کا، اس سے مت الجھو۔'' دوسری طرف سے کسی نے بالے کو متنبہ کیا۔

''میں پر دادا ہوں اس کا۔'' یہ کہہ کر بالے نے قبل اس کے کہ سیاہ فام آدمی کا گھونسا بلند ہو، داہنے ہاتھ سے ایک اتنا مضبوط گھونسا اس کی کنپٹی پر رسید کیا کہ وہ اپنے پیچھے کے دو آدمیوں پر گرتا ہوا ان کے سمیت زمین پر جا رہا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر مجمع میں سے کچھ آدمیوں کے ہاتھ بالے پر بلند ہوئے ہی تھے کہ کسی کی آواز نے ان کو چونکا دیا۔

''کیا کرتے ہو؟ یہ پولیس سارجنٹ ہے۔''

''سارجنٹ؟'' کئی آوازیں حیرت سے نکلیں اور اٹھے ہوئے ہاتھ جھک گئے۔ بالے نے اس آدمی کو پھر گریبان سے تھام کر اٹھا لیا، لیکن اب اس میں ہمت نہ تھی کہ قانون کے ایک محافظ کا مقابلہ کرے۔

Akram Allahabadi

''آئندہ تمہارے منہ سے قانون کی توہین میں ایک لفظ بھی نکلا تو بتیسی باہر آجائیگی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اسے ایک طرف دھکیل دیا، لیکن اس آدمی کو دیکھ کر وہ مسکرا دیا جس نے مجمع کو للکار کر روکا تھا۔ وہ مجمع میں سب سے علیحدہ اور بلند نظر آرہا تھا، جیسے ککروندے کی جھاڑیوں میں بانس کا درخت اگ آیا ہو۔ وہ جرنلسٹ لانگ فیلو تھا۔

''چلو، تم باہر چلو۔'' بالے نے والومین کو آگے کرتے ہوئے کہا اور وہ مشکور نظروں سے اسے دیکھتا ہوا آگے آگے چلنے لگا۔ ''اور آئندہ خیال رکھو کہ تم پبلک کے حاکم نہیں نوکر ہو۔ عوام کے ساتھ بدتمیزی کا انجام اس سے بھی برا ہوسکتا ہے۔'' بالے نے اسے نصیحت کی اور اس کے ان الفاظ نے مجمع کا اشتعال تقریباً ختم کر دیا۔ کسی نے ان کی مزاحمت نہ کی۔ بالے مجمع سے باہر آکر اس وقت تک والومین کو سڑک پر جاتا دیکھتا رہا جب تک کہ وہ مجمع کی دسترس سے دور نہ ہوگیا ہو۔ پھر وہ اپنی موٹر سائیکل کی طرف پلٹا تو کیریئر پر لانگ فیلو بیٹھا ہوا تھا۔ لوگ اب منتشر ہو چکے تھے اور وہ دادا تو گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہوگیا تھا۔

''بیٹے سارجنٹ، شکریہ ادا کرو ہمارا۔'' لانگ فیلو نے کہا۔

''کس خوشی میں؟'' بالے نے منہ بنا کر پوچھا۔

''میں نہ آجاتا تو سرِ اقدس پر ایک بھی بال نظر نہ آتا۔''

''یہ غلط فہمی کیسے ہوئی تمہیں؟ لوگ تو یہ سمجھ کر دیکھنے لگے تھے کہ آدمیوں کے ہجوم میں اونٹ کیسے گھس آیا۔''

''اب جھینپ مٹانے کو جو کچھ کہہ لو، لیکن احسان تو ماننا ہی پڑے گا۔''

''میرے گلے مت پڑ، بھائی۔ مجھے بہت سے کام ہیں۔'' بالے موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''کم از کم ایک فرسٹ کلاس لسی پلائے بغیر تم نہیں جاسکتے، ورنہ...''

''ورنہ کیا؟''

Akram Allahabadi

''ابھی آواز لگا کر لوگوں کو پھر سے جمع کرلوں گا کہ یہ سارجنٹ نہیں چار دو صفر ہے۔''

''چلو اتر و میری گاڑی سے۔''

''کیوں؟''

''تم یہاں کھڑے ہو کر آواز لگاؤ، مجھے فرصت نہیں ہے۔''

''میں نہیں اترونگا۔''

''اف...فوہ..کس کم بخت نے کھول دیا چڑیا گھر کا دروازہ۔'' بالے بڑبڑاتا ہوا موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے لگا۔

''کہاں جاؤ گے؟''

''جہنم میں۔''

''اچھا چلو، میں دروازے تک تمہیں چھوڑ کر لوٹ آؤنگا۔''

''بڑے ڈھیٹ ہو، یار۔'' یہ کہہ کر اس نے موٹر سائیکل بڑھادی۔

لیکن لانگ فیلو کو یہ ضد مہنگی پڑی۔ اگلے چوراہے پر ہی بالے نے موٹر سائیکل ٹرافک کے بہانے روک لی۔

''سبحان تیری قدرت، کیا بنائی ہے عورت۔'' بالے نے سڑک کی دوسری سمت سے گزرتی ہوئی ایک سیاہ فام عورت کی طرف دیکھ کر کہا۔ اور جیسے ہی لانگ فیلو نے اس عورت کو دیکھنے کے لیے لاپرواہی سے نصف بدن گھمایا، بالے نے جھٹکے سے موٹر سائیکل آگے بڑھادی اور کیریئر سے پھسل کر لانگ فیلو سڑک پر ہی رہ گیا۔ وہ اس وقت تک منہ ہی منہ میں گالیاں بکتا رہا، جب تک کہ بالے کی موٹر سائیکل اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

اور دو لاشیں

''ایک اور لاش۔'' سپرنٹنڈنٹ خان دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر بڑبڑایا۔ بشرے سے نمایاں استقلال پسندی کے باوجود اس کا موڈ اس وقت بھرا ہوا سا نظر آ رہا تھا۔

''ایک اور لاش۔'' اس نے میز پر پڑے ہوئے پیپر ویٹ پر نظریں جما کر دہرایا۔

''تکرار ارشاد۔''

''تم چپ رہو۔''

''میں سمجھا آپ کوئی ترقی پسند شعر موزوں کر رہے ہیں۔''

''میں تمہاری کھوپڑی موزوں کر دوں گا، اکو۔''

''ہائے، پولیس والے ادب کی قدر کیا جانیں۔''

''لیکن ابھی تک یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ آئیں کہاں سے۔'' خان بڑبڑایا۔

''جہاں سے سب آتے ہیں۔'' بالے نے پھر لقمہ دیا۔

''پھر بک چلے۔''

''آخر آپ اتنی دیر سے خود ہی سوچ رہے ہیں، خود ہی بڑبڑا رہے ہیں۔ ایک شریف آدمی سامنے بیٹھ کر بور نہ ہوگا تو کیا کرے گا۔''

''اس لڑکی کا کیا ہوا؟'' خان نے بالے کے چہرے پر نظریں جما کر پوچھا۔

''وہی جو ہونا تھا۔''

''شامت آئی ہے کیا؟''

''اگر آپ تقدیر کے قائل نہیں تو صاف صاف یہ کہ وہ قتل کر دی گئی۔''

''میں قتل کے بعد کی بات کر رہا ہوں۔''

Akram Allahabadi

''بقدرِ اعمال جہنم یا جنت میں گئی ہوگی۔''

''بالے، اب میں تم پر چارج شیٹ لگا دونگا۔''

''کمال ہے۔ یعنی کہ میں کیا اس کی موت کے بعد کے حالات معلوم کرنے کے لیے آسمان پر چلا جاتا۔''

''میں تفتیش کی رپورٹ پوچھ رہا ہوں۔''

''وہ گارسن اینڈ کو میں ٹائپسٹ تھی۔''

''یہ بات چھپی ہوئی نہیں۔''

''دفتر سے فارغ ہو کر گھر جانے سے پہلے کیفے نشاط میں کافی پیتی تھی۔''

''اکیلی؟''

''نہیں، کوئی کالے منہ کا رقیب بھی ساتھ ہوتا ہوگا۔''

''پھر بکواس۔''

''میں رقیبِ روسیاہ کے بارے میں عرض کر رہا ہوں۔''

''آخری بار وہ کس کے ساتھ دیکھی گئی تھی؟''

''وہ کبھی کبھی دفتر کے کلرکوں میں سے ہی کسی دوست کے ساتھ وہاں آتی تھی، لیکن پچھلے چند دنوں سے اس میں ایک خاص تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔''

''مثلاً؟''

''میں یہ نہ کہونگا کہ وہ لڑکی لڑکا بن رہی تھی۔''

''اف فوہ.. کمبخت۔''

''بالکل کمبخت۔ ایسی لڑکیوں کو اور کیا کہا جا سکتا ہے۔''

''میں تمہیں کہہ رہا ہوں، سور۔''

''خیر سور ہی سہی۔ میں تو کہہ رہا تھا کہ اس کی پراسرار موت کے چار پانچ دن قبل

سے وہ او ور حیثیت ہوگئی تھی ۔"

"کیا بچتی تھی؟"

"جی نہیں، بلکہ اس کا معمولی لباس شاندار پوشاک سے بدل گیا تھا، سج دھج بڑھ گئی تھی اور دفتر سے واپسی پر وہ کیفے نشاط کے باہر ہی فٹ پاتھ پر کسی کا انتظار کرتی رہتی ۔"

"ہُم ۔" خان نے سر ہلایا ۔

"آپ تو اس طرح سر ہلا رہے ہیں جیسے وہ آپ ہی تھے ۔"

"آگے چلو ۔"

"آگے چلونگا تو سامنے دیوار.."

"شٹ اپ ۔" خان بگڑ گیا ۔

"تحقیقاتی بوریت دور کر رہا ہوں ۔ ویسے آپ خود ہی سوچیے کہ وہ کس کا انتظار کرتی تھی ۔ اگر یہی معلوم ہو جاتا تو بالے صاحب سارجنٹی چھوڑ کر پروفیسر سامری کا دھندا نہ شروع کر دیتا ۔"

"کیا کسی نے بھی اس آدمی کو نہیں دیکھا؟" خان نے سوال کیا ۔

"وہ ایک لمبی سی شاندار کار میں آیا کرتا تھا، لیکن اندھیرا ہونے کے بعد ۔ لڑکی فوراً ہی کار کی اگلی نشست پر بیٹھ جاتی اور کار کسی توقف کے بغیر آگے روانہ ہو جاتی ۔"

"اس کار کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکا؟"

"قطعی نہیں ۔ سڑک چلتے لوگ سراغرساں نہیں ہوتے کہ ہر چیز کو نظر میں رکھیں اور پھر یہ کسے خواب آیا تھا کہ وہ جہنم رسید ہونے والی ہے ۔"

"کم از کم ماڈل وغیرہ؟"

"اندازہ ہے کہ لینڈو باڈی شیور لیٹ اور غالباً ۱۹۵۱ء کا ماڈل رہی ہوگی ۔"

"ایسی ہزاروں گاڑیاں شہر میں موجود ہیں ۔" خان بڑبڑایا ۔

Akram Allahabadi

''اور پھر یہ بھی تو نہیں کہا جا سکتا کہ کار والے نے ہی اس کا قصہ پاک کیا ہو۔''

''ایک ہی قسم کی تین وارداتیں ہو چکی ہیں اور تینوں اسی جھیل میں۔''

''اخبار والے اس قدر اچھال رہے ہیں کہ پبلک میں ہیجان پیدا ہو گیا ہے۔''

''یہ حرکت لانگ فیلو کی معلوم ہوتی ہے۔ وہ آج کل پولیس سے کچھ جلا ہوا ہے۔''

''حرکت کسی کی بھی ہو اس سے غرض نہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم اب تک اس سلسلے میں کیا کر سکے ہیں۔ دو خون ہو چکے ہیں اور وہ پہلی سڑی ہوئی لاش بھی ضرور وارداتِ قتل ہی رہی ہو گی۔''

''اللہ چوتھی بھی دکھائے۔''

''بدتمیزی کرو گے تو باہر نکال دوں گا۔''

''میں تو کام کاج میں برکت کی دعا کر رہا تھا۔''

''لڑکی کہاں رہتی تھی؟''

''گوجر اسٹریٹ میں۔ پسماندگان میں ایک ماں اور ایک چھوٹا بھائی ہے اور یہ بھی معلوم کر چکا ہوں کہ اپنے گھر پر نہ وہ کسی دوست کو بلاتی تھی نہ کوئی اس سے ملنے آتا تھا۔''

''پچھلی لاش بھی اسی طرح ڈونگرا جھیل میں تیرتی پائی گئی تھی۔''

''انھیں خودکشی تو نہیں کہا جا سکتا۔''

''تینوں کیس یکساں نہ ہوتے تو خودکشی کا شبہ ہو سکتا تھا۔''

''اس کے علاوہ بھی خودکشی کرنے والے کسی نہ کسی کے نام اپنا کوئی آخری پیغام یا اطلاع چھوڑ جاتے ہیں جبکہ ان لاشوں کے جسموں پر تو کپڑے تک نہ تھے اور...''

''کسی نے اتار کر چور بازار میں بیچ دیے ہوں گے۔''

لیکن کوئی جواب دینے کی بجائے خان کرسی کی پشت سے ٹک کر کچھ سوچنے لگا۔

پچھلے کیس کا معاملہ تو خودکشی قرار دے کر کسی طرح دبا دیا گیا تھا، لیکن پچھلے ایک ہفتے

میں ایسے تین کیس ہوئے تھے جنھوں نے سارے شہر میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ پانچ دن قبل ڈونگرا جھیل سے ایک اور لاش برآمد ہوئی تھی۔ ایک بھرپور جوان اور خوبصورت لڑکی کی بالکل ننگی لاش۔ یہ لڑکی ایک خوش حال گھرانے کی تعلیم یافتہ اور ترقی پسند قسم کی لڑکی تھی اور اکثر شام کے اوقات میں کافی ہاؤس میں دیکھی جاتی تھی۔ اس کے تعلقات بہت سے سیاست دانوں سے تھے۔ اور کافی ہاؤس میں شام کے اوقات میں زیادہ تر انقلابی قسم کے سیاسی ورکر اور مختلف اخبارات میں کام کرنے والے جرنسلٹ ہی دیکھے جاتے تھے۔

یہ لڑکی جس کا نام زہرہ مقتدر تھا، خود بھی سیاسیات سے گہرا لگاؤ رکھتی تھی۔ وہ کبھی کبھی کسی ایک انقلابی مخصوص پارٹی کے لیے کام کرتی بھی دیکھی گئی تھی۔ پھر اچانک ایک صبح اس کی گمشدگی کی رپورٹ اس کے والدین کی طرف سے جام دیوی پولیس اسٹیشن کو ملی اور دوسری صبح اس کی لاش جھیل ڈونگرا میں تیرتی پائی گئی اور اس پر کسی قسم کے زخم کا کوئی نشان نہ تھا۔ صرف گردن پر ناخنوں کی کچھ خراشیں پڑی تھیں، جو زیادہ گہری نہ تھیں۔ نہ ہی کچھ ایسی علامات تھیں جن سے یہ کہا جا سکے کہ گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے۔ البتہ ان وارداتوں کو زیادہ دہشت انگیز اور پراسرار بنانے والی دو چیزیں ایسی تھیں جنھیں دیکھ کر ایک لمحے کے لیے دل دھک سے رہ جاتے۔ مصلحتاً پولیس نے ان باتوں کا ذکر وارداتوں کی اخباری رپورٹ میں نہیں کیا تھا، لیکن خود پولیس کے حلقوں میں یہ باتیں زیرِ بحث تھیں۔ پہلی بات یہ کہ اس لاش کا ایک طرف کے سینے کا گوشت کٹا ہوا تھا اور سا نولایا ہوا سا سرخ سرخ گوشت صاف نظر آ رہا تھا۔ دوسری چیز بدن کے نچلے حصے میں ایک ایسا زخم تھا جس کی تشریح بھی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں صرف 'برائے پولیس' کی گئی تھی۔ بہرحال سول سرجن کے یہ الفاظ کہ 'ایسی درندگی کا مظاہرہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا'۔

پریس کے لیے اتنا کافی تھا اور اسی پر اخباروں نے ان وارداتوں کو اس قدر سنسنی خیز بنا کر پیش کیا جس سے ہر طرف کھلبلی مچ گئی۔ پولیس پر سوالات کی بوچھار ہونے لگی، لیکن شعبۂ سراغرسانی کا مردِ آہن، سپرنٹنڈنٹ خان، اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ اس نے پریس رپورٹروں کو کچھ

بھی بتانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ 'قانون اپنی ذمے داریوں کو سمجھتا ہے'۔

☆☆☆☆☆☆

ایک ہفتہ گزر جانے کے باوجود اس کیس کا کوئی سراغ نہ مل سکا اور پھر آج ہی اس جھیل پر سے یہ تیسری لاش برآمد ہوئی۔ یہ لاشیں جس عالم میں برآمد ہوئی تھیں ان سے اس بات کا امکان ۲۵ فیصدی بھی نہ پایا جاتا تھا کہ یہ خودکشی کے کیسز ہو سکتے ہیں۔ مچھلیاں اگر لاشوں کو کتر کر بگاڑتیں بھی تو ان کی کیفیت میں یکسانیت اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں ایک پولیس کے لیے مخصوص حوالہ ۷۵ فی صدی ان کے پراسرار ہونے کی دلالت کرتا تھا۔ پوسٹ مارٹم کرنے والے سول سرجن ڈاکٹر سریواستوا کا خیال تھا کہ ان کی موتیں پانی میں گرنے سے کچھ گھنٹے قبل واقع ہوئی ہوں گی اور غالباً کوئی شدید اذیت ہی ان کا سبب ہوئی ہوگی۔ اور اس شدید اذیت کا راز ابھی خود بھی غیر واضح تھا، سول سرجن جانتا تھا یا سپرنٹنڈنٹ خان۔

بہر حال ان تمام باتوں کے باوجود اس بات سے انکار ناممکن تھا کہ یہ اپنی نوعیت کے عجیب و غریب کیس تھے اور شہر کے دو اوسط گھرانوں کی دو نوجوان اور خوبصورت لڑکیوں کو جس دہشتناک طریقے پر قتل کیا گیا تھا، وہ جرائم کی تاریخ میں ایک افسوسناک اضافہ تھا۔ خان نے خود نے سب سے زیادہ معتمد اسسٹنٹ سارجنٹ بالے کو بھی اس سلسلے میں اپنے نظریات سے پورا پورا آگاہ نہیں کیا تھا۔ بالے خود بھی چکر میں تھا کہ یہ واردا تیں کیوں اور کیسے ہوئیں۔ اب تک پولیس ہیڈ کوارٹرز کے محکمۂ خفیہ کے انویسٹی گیشن روم میں دونوں مقتولہ لڑکیوں کے تقریباً دو درجن متعلقین، واقف کار اور دوست تحقیقاتی سوال و جواب کے سلسلے میں خان کے سامنے سے گزر چکے تھے، لیکن ان میں کوئی شخصیت ایسی نہ ملی جو حالات پر کوئی روشنی ڈال سکتی یا جس پر اس سلسلے میں کوئی شبہ کیا جا سکتا۔ اور پہلی لاش کی شناخت کا مسئلہ تو پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ رؤف اور ڈیسوزا نے بھی پچھلے چار دنوں سے سابقہ مقتولہ لڑکی کے آخری دنوں کی نقل و حرکت

اور قبل از قتل تک کے اس کے ملنے والوں کے سراغ و تفتیش میں مصروف تھے اور آج کی تیسری لاش نے اس جدوجہد کو اور وسیع کر دیا۔ خان کے لامحدود اور خفیہ ذرائع بھی اس بار جلد ہی کوئی کارآمد نتائج فراہم نہ کر سکے اور اسی وجہ سے آج سے اسے خود اپنی تمام تر توجہ ان کیسز پر مبذول کرنی پڑی تھی۔ وہ اس کے لیے فکرمند نہیں تھا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مجرم کتنے ہی چالاک اور دلیر کیوں نہ ہوں، وہ انھیں جلد یا بدیر اپنی گرفت میں لے آئے گا۔ لیکن زندگی میں پہلی بار جذباتی طور پر وہ ان لاشوں سے متاثر ہوا تھا۔ دو باعزت شہریوں کی نوجوان دختروں کی لاشیں۔ وہ معصوم جوانیاں جن کے خون میں شہریت کے احترام اور انسانیت کے تقاضوں کا جنازہ ڈوب چکا تھا۔ اس کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اس نے اسے جذباتی طور پر مشتعل کر دیا تھا، لیکن اگر یہ راز وہ عام کر دیتا تو شہر میں ایک نیا ہیجان اٹھ کھڑا ہوتا۔

پچھلے کیس سے لے کر اب تک وہ اس قدر مصروف رہا تھا کہ بعض اوقات سارجنٹ بالے کو یہ بھی نہ معلوم رہتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔ دفتر میں بھی وہ تھوڑی دیر کے لیے آتا تھا اور ضروری کاغذات پر دستخط کرنے کے بعد پھر اپنی گاڑی لے کر چلا جاتا۔ وہ اتنے دنوں سے صرف اپنی ہی کار استعمال کر رہا تھا، ورنہ بالعموم وہ کسی معاملے میں زیادہ بھاگ دوڑ کے لیے محکمے کی ڈاج اسٹیشن (اسٹاف کار) استعمال کیا کرتا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

''صاحب، ڈی سی پی صاحب یاد فرماتے ہیں۔'' اردلی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''ہُم۔'' وہ خیالات کی رو میں بہکا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''مجھے روزآنہ پیڈ سٹانے یاد فرمایا ہے۔'' بالے بھی اٹھتے ہوئے بولا۔

''کون؟'' خان نے انہماک سے چونک کر پوچھا۔

''ہیلن آف ٹرائے کے ٹکٹ بک کرا چکا ہوں۔''

''جہنم میں جاؤ۔'' خان جھنجلا گیا۔

''آپ نہیں چلیں گے؟''

''وہاٹ؟'' خان کا موڈ بگڑ گیا۔

''ہیلن آف ٹرائے... میں نے ٹکٹ بک...'' بالے نے جلدی سے بات بنادی۔

''تم کہیں نہیں جاؤ گے۔'' خان اسے گھورنے لگا۔

''اور ٹکٹ کے پیسے؟''

''بکومت۔''

''میں پانچ سو پچیس نئے پیسے آپ کے نام کھاتے میں جمع کر دونگا۔'' بالے بڑبڑاتا ہوا بیٹھ گیا۔

ڈی سی پی خان کا منتظر تھا۔اس کے بشرے پر بے اطمینانی کے آثار نمایاں تھے۔ پونے چھ فٹ کے قد والا یہ بھاری بھرکم بارعب پولیس آفیسر اپنی ۵۵ سالہ عمر میں بھی دو چار آدمیوں پر بھاری نظر آتا تھا۔سر کے بالوں میں زیادہ تر سیاہ تھے، لیکن کنپٹی کے بالوں میں سفیدی زیادہ نمایاں ہو گئی تھی۔اپنی تیز چمکیلی آنکھوں سے جب وہ اسامنے پیش ہونے والے مجرموں کو گھورتا تو وہ کانپ اٹھتے، لیکن خان کی خود معتمد شخصیت کے برخلاف ان میں خود اعتمادی کم تھی۔وہ بگڑے ہوئے حالات میں جلد گھبرا جاتا تھا اور بعض اوقات معمولی سی کامیابیوں پر بھی اعتدال سے زیادہ متاثر ہو جاتا۔ٹہلنے یا گفتگو کرتے وقت ہر چند سیکنڈ کے وقفے سے اپنے کاندھوں کو سکوڑنا اس کی عادت میں داخل تھا اور جب وہ کسی مسئلے پر کچھ سوچتا ہوا ٹہلتا تو اس کی نگاہیں اپنے قدموں پر ہوتی تھیں اور یہ قدم معمول سے زیادہ فاصلے پر پڑتے تھے۔جس طرح خان کی فطرت خوف وفکر سے نا آشنا تھی، اسی طرح ڈی سی پی کی فطرت اس کے برعکس تھی۔یہ نہیں کہ وہ مجرموں کی سنسنی خیزیوں یا کام کے الجھاؤ سے پریشان یا خوفزدہ ہو، بلکہ اسے اپنے

محکمے کے وقار کی فکر اور وزارتِ داخلہ کے اعلیٰ احکام کی ناراضگی یا بدگمانی کا خود پریشان کیے رہتا تھا۔ اگر سپرنٹنڈنٹ خان جیسے عظیم سراغ رساں کی خدمات اس کے محکمے کو حاصل نہ ہوتیں تو سنسنی خیز اور پراسرار جرائم کے اس شہر میں اس محکمے کے لیے اپنا وقار برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا۔

خان کی طرف دیکھ کر ایک خفیف سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری اور پھر معدوم ہو گئی۔

''مجھے یاد فرمایا ہے۔'' خان نے سلام کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں، بیٹھیے۔'' وہ اپنے کاندھے سکوڑ کر بولا۔

''آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں؟'' خان نے بیٹھتے بیٹھتے پوچھا۔

''پریشانی کی ایک ہی کہی۔ ذرا اسے پڑھیے۔'' ڈپٹی کمشنر نے ایک کانفیڈنشل رپورٹ اس کی طرف بڑھا دی۔ خان اسے ہاتھ میں لے کر پڑھنے لگا اور ڈی سی پی پریشانی کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کمرے میں مضطرب انداز میں ٹہلنے لگا۔

''اگر محکمۂ صحت اس کی روک تھام بروقت نہ کر سکا تو آپ جانتے ہیں کیا ہوگا۔'' ڈی سی پی نے خان سے سوال کیا۔

''شہریوں کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ کالرا اور دوسری مہلک بیماریاں پھوٹ پڑیں گی۔'' خان نے رپورٹ پر نظریں جماتے ہوئے جواب دیا۔

''اور ہم کچھ بھی نہ کر سکیں گے، قانون کے ٹھیکیدار، عوام کی جان و مال کے محافظ۔'' ڈی سی پی کا لہجہ ان کے ذہنی انتشار کی ترجمانی کر رہا تھا۔ خان کی نظریں صیغۂ راز کی اس رپورٹ پر جمی ہوئی تھیں۔

رپورٹ محکمۂ صحت عامہ کے ڈائرکٹر جنرل کی طرف سے تھی اور اس پر ہائیڈرالک انجینیر کی تصدیق بھی موجود تھی۔ ہائیڈرالک انجینیر اس جھیل سے متعلق شہری واٹر سپلائی کا انچارج تھا اور ڈونگرا جھیل کا پانی شہر کے مغربی حصے میں پائپ لائن ویسٹ نمبر ا تا نمبر ۷ کے ذریعے سپلائی کیا جاتا تھا۔ رپورٹ میں لکھا تھا کہ:

Akram Allahabadi

جھیل میں پچھلی دو لاشوں کے پائے جانے کے بعد پانی میں جو جراثیم پائے گئے تھے وہ فلٹریشن کے باوجود پانی کی رسد کے چھوٹے پائپوں کے ذریعے شہریوں تک پہنچ رہے تھے۔محکمۂ صحت نے اگرچہ جراثیم کش دوائیں پانی میں ملا کر ان کے اثرات کو روکنے کی کوشش کی ہے، لیکن آج حالات زیادہ نازک ہو گئے ہیں، کیونکہ ایک تیسری لاش بہت خراب اور خستہ حالت میں جھیل کے مشرقی کنارے پر تیرتی پائی گئی ہے۔ہائیڈرالک انجینئر کا بیان ہے کہ اگر ایک اور واردات ایسی ہوئی تو پھر شہر کے مغربی حصے کی آبادی کا خدا حافظ۔

وزارتِ داخلہ سے شہری زندگی کے تحفظ کے نام پر اپیل کی جاتی ہے کہ اس قسم کی کسی بھی واردات کے امکانات کا فوراً سدِ باب کیا جائے۔نیچے ڈائرکٹر جنرل کے دستخط تھے۔

اس خط نے خان جیسے غیر متزلزل آدمی کو بھی ایک خوفناک مستقبل کے خیال سے لرزا دیا۔بظاہر بات اتنی سی تھی کہ پراسرار طور پر تین خوبصورت جوان لڑکیوں کے خون ہو چکے تھے اور ان کی لاشیں کسی طرح جھیل ڈونگرا میں پھینکی جا چکی تھیں، لیکن محکمۂ صحت کی اس رپورٹ کے مطابق تو حالات نے اچانک دوسرا ہی رخ اختیار کر لیا تھا۔شاید ان وارداتوں کی پشت پر کام کرنے والی نامعلوم شخصیت بھی یہ نہ سوچ سکی ہوگی کہ ان کا ردِ عمل اس قدر خوفناک ہوگا۔یہ ایک دوسرا ہی سوال تھا کہ یہ قتل کیوں اور کس طرح ہوئے اور کس نے کیے۔اس درندہ صفت خوفناک مجرم یا مجرموں نے اگر ان لاشوں کو کسی پہاڑی پر یا کسی گٹر میں کہیں اور بھی پھینک دیا ہوتا تو نتائج مقتول قاتل اور پولیس تک ہی محدود رہتے، لیکن شہر کو پینے کا پانی فراہم کرنے والی اس جھیل میں ان لاشوں کو پھینک کر ان کے سڑ جانے سے پیدا ہونے والے جراثیم کے ذریعے لاتعداد شہریوں کی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا گیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

محض پہلی ہی لاش جب جھیل ڈونگرا میں سڑی ہوئی کیفیت میں پائی گئی تھی، اس

وقت شہر میں جو زبردست ہیجان پھیلا ہوا تھا اسے ہی کنٹرول کرنا مشکل ہوگیا تھا، لیکن محکمۂ صحت کی بروقت توجہ اور انتھک محنت نے صورتِ حال کو اس وقت سنبھال لیا اور جھیل کا پانی پبلک کے لیے ضرر رساں نہ بن سکا۔ ان فوری اقدامات کی وجہ سے بات دو چار دن میں دب گئی تھی اور لوگ بھول چکے تھے کہ انھوں نے ایک ایسی جھیل کا پانی پیا ہے جس میں تین چار دنوں سے ایک انسانی لاش پڑی سڑتی رہی ہے، مگر اس نوعیت کے ایک دوسرے اور تیسرے کیس نے پھر پورے شہر میں سنسنی پھیلا دی اور اس بار پریس کی کڑی تنقیدوں کا رخ محکمۂ صحت اور محکمۂ آب رسانی کی بجائے پولیس کی طرف گھوم گیا۔ سب طرف سے ایک ہی سوال کیا جا رہا تھا کہ تین تین وارداتیں ہو جانے کے باوجود پولیس اب تک کیا کر رہی ہے۔ کیا محکمۂ خفیہ اتنا ناکارہ ہے کہ اس کی آنکھوں کے سامنے پے در پے وارداتیں ہو رہی ہیں اور اب تک مجرموں کا سراغ نہیں لگ سکا ہے، نہ ہی یہ تصدیق کی جاتی ہے کہ یہ خودکشی کے کیسز تو نہیں، اور اگر ہیں تو ثابت کیا جائے۔

پبلک میں بھی وہی سوال گونج رہا تھا جو پریس میں، اور پولیس کے اعلیٰ احکام خود بھی پریشان تھے۔ خان کو بار بار آئی جی اور کمشنر طلب کرتے، لیکن اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ میرے پاس الہ دین کا چراغ نہیں ہے جو چٹکیوں میں کام ہو جائے۔ بہرحال میں حتی الامکان ان اسرار کو جلد از جلد منکشف کرنے کی کوشش کرونگا۔ اس نے ڈی آئی جی کو بھی بتا دیا تھا کہ یہ خودکشی کے کیسز نہیں ہیں، بلکہ قتل کی پراسرار وارداتیں ہیں جن کی پشت پر کوئی بہت چالاک اور خوفناک شخصیت یا طاقت کام کر رہی ہے جو جھیل ڈونگرا پر پولیس کی سخت نگرانی کے باوجود یہ لاشیں جھیل میں پہنچا دی جاتی ہیں۔

پبلک کے غیر تعلیم یافتہ اور وہم پرست حلقوں میں تو کچھ اور عجیب سی افواہیں پھیلنا شروع ہو گئی تھیں۔ بہت سے لوگ پولیس کے انتظام کے باوجود جھیل میں نظر آنے والی ان لاشوں کے واقعات کو آسیب یا مافوق الفطرف حالات سے تعبیر کر رہے تھے اور لوگوں کی

اکثریت جھیل کے پانی کا استعمال بند کر کے شہر کے اندر گئے کنوؤں پر ٹوٹ پڑی تھی۔ یا پھر وہ شہر کے مشرقی اور شمالی علاقوں سے پانی منگواتے تھے۔ محکمۂ صحت کو بھروسہ تھا کہ اگر کوئی ایسی واردات پھر نہ ہوئی تو وہ جھیل کے پانی کو بے ضرر کرنے اور فلٹریشن میں پیوریفائنگ پلانٹ لگا کر اسے شفاف کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ ورنہ مجبوراً مغربی علاقوں کو مین پائپ لائن کو ڈونگرا جھیل سے منقطع کر کے عارضی طور پر مشرقی اور شمالی حصے کے مین پائپ سے جوڑنا پڑتا جس میں کم از کم ایک مہینے کا ٹائم ضرور لگتا خواہ کتنی ہی جلدی کیوں نہ کی جاتی۔

اس کے علاوہ ایسا قدم اٹھانے سے ان دوسرے علاقوں میں بھی پانی کی قلت واقع ہو جاتی اور پورا شہر اس سے متاثر ہونے لگتا۔

مغربی حصے کی آبادی کے بہت سے صاحب حیثیت لوگ بھی ان حالات سے ڈر کر دوسرے علاقوں کو منتقل ہونے لگے تھے اور اس تمام ہنگامی صورتِ حال کی ذمے دار تھیں وہ پراسرار وارداتیں جن کا سراغ اب تک پولیس بھی نہ لگا سکی تھی۔

خان خود جھیل پر دو تین راتوں تک نگرانی کر چکا تھا۔ جھیل کا محاصرہ کرنے والی مسلح پولیس بڑی مستعدی سے اپنے فرائض انجام دے رہی تھی اس لیے یہ توقع ناممکن سی تھی کہ کوئی دن یا رات کے وقت ایک انسانی لاش کو کسی سمت سے جھیل تک پہنچا سکے گا۔

جھیل میں داخل ہونے والے مین پائپس کے کنیکشن بھی سب وہ چیک کر چکا تھا۔ پانی ان سے فلٹر اسٹیشن تک جاتا تھا اور ان پائپوں میں سے کسی لاش کا جھیل تک آنا ناممکن ہی تھا، کیونکہ ان کے ڈرین ہول نہیں تھے، وہ فلٹر اسٹیشن تک براہِ راست جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ جو خارجی ڈرین ہول تھے، وہ ایسے نالوں کے تھے جو صرف برسات ہی میں چلتے تھے باقی موسم خشک رہتے اور ان کے دہانوں پر لوہے کی سلاخوں کے دروازے نصب تھے۔

کوئی راستہ ایسا سمجھ میں نہیں آتا تھا جس سے ان لاشوں کو جھیل تک پہنچائے جانے یا جھیل میں پھینکے جانے کا امکان ہو اور ان ہی حالات نے خان جیسے بیدار مغز سراغ رساں کو

بھی چکر میں ڈال دیا تھا۔ وہ اب تک صرف اس قدر نتائج برآمد کر سکا تھا کہ کسی مخصوص ذہن کا کوئی خوفناک انسان یا انسانوں کا گروہ ان لڑکیوں کو بڑی بے رحمی سے ہلاک کرتا ہے اور پھر کسی نامعلوم طریقے سے ان کی لاشیں جھیل میں پھینک دی جاتی ہیں۔ پولیس کی نگرانی کیونکہ خفیہ تھی، اس لیے شاید اس گروہ یا شخصیت کو اس کا علم نہیں تھا، ورنہ شاید وہ اپنا طریقِ کار بدل دیتا اور اگر پولیس کی تگ رانی کھلے بندوں کر دی جاتی تو پھر ان پراسرار مجرموں کو ہاتھ آنے یا ان کے سراغ کے امکانات بھی ختم ہو جاتے۔

اور پھر ایک ہفتے کی طویل خاموشی کے بعد خان نے اچانک اقدام کیا۔ وہ بالکل ہی سمجھ میں نہ آنے والا، حالات سے غیر متعلق اور عجیب تھا۔ اتنا عجیب کہ اس کے اعلیٰ افسران بھی اسے خبط یا حماقت سے تعبیر کیے بغیر نہ رہ سکے، لیکن وہ اس کے حسنِ کارکردگی سے اس قدر مرعوب تھے کہ انھوں نے اس کے کام میں دخل نہ دیا۔ ان کے خیال میں سپرنٹنڈنٹ خان اندھیرے گھر میں گرنے والی سوئی کو روشن بازار میں تلاش کر رہا تھا۔

اس نے بالے کو بھی کچھ نہیں بتایا اور بالے اس معاملے میں دوسروں سے زیادہ ہی حیران تھا، لیکن اسے ی اعتماد ضرور تھا کہ اس کے باس کا کوئی اقدام غلط نہیں اٹھتا اور وہ خود ایک ایسی شخصیت ہے جو اپنے قیمتی وقت کا ایک لمحہ بھی کسی فضول چیز پر ضائع کرنا پسند نہیں کرے گا۔ اس بار خان کا رویہ خود اس کے محکمے کے لیے پراسرار بن گیا تھا اور ہر ایک بے چینی سے اس کے عجیب اور نامعلوم اقدامات کے نتائج کا انتظار کر رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

شوہر والی

''مرگیا۔''

''کون مرگیا؟''

''ارے وہ جو کہا ہے کسی نے کہ۔اس کی نگہ ناز پہ مرگیا میرا دل وغیرہ۔''

''تمہارے قبلہ وکعبہ نے بھی کبھی شاعری سے شوق فرمایا تھا؟''

''لو، وہ کیا فرمائیں شوق ووق۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ شاعری چارہ سمجھ کر سب گدھے چرنے لگے۔''

''یہ تم اپنے والد صاحب کی شان میں کہہ رہے ہو۔''

''مثال دی ہے میں نے تو۔ ارے خاں، تم تو زبان پکڑنے لگتے ہو۔''

''اچھا خیر، تو کون مرا ہے؟ تمہارا دل؟''

''کوئی نہیں۔ میں نے تو شعر پڑھا تھا۔'' شوکت نے برا سا منہ بنالیا۔شاید وہ سمجھ گیا کہ بالے بھرے ہوٹل میں اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔اس نے بچوں کی طرح منہ لٹکا لیا اور ایسی نظروں سے بالے کو گھورنے لگا جیسے کہہ رہا ہو جاؤ ہم تم سے نہیں بولتے۔

جس لڑکی کو وہ اتنی دیر سے عاشقانہ نظروں سے گھور رہا تھا، وہ دینا ناتھ رائے کی سب سے چھوٹی بیٹی سیتا تھی۔ بنگالی نقش ونگار تو ویسے بھی جاذب نظر ہوتے ہیں، لیکن اس پر اس کی کھلی ہوئی رنگت اور سڈول جسم نے اسے چلتی پھرتی قیامت بنادیا تھا۔

اپنی سرخ ساڑی میں وہ جوان دلوں کا خون نچوڑتی پھر رہی تھی۔ دینا ناتھ درآمد برآمد کا بزنس کرتے تھے اور دولت مند ہونے کے علاوہ شہر میں خاصی بااثر شخصیت رکھتے تھے۔ یہ پارٹی ان ہی کی طرف سے دی گئی تھی، کیونکہ ان کی منجھلی لڑکی کا شوہر، اجے کمار رائے، حکومت

Akram Allahabadi

ہند کی طرف سے منتخب ہو کر سیلون میں ہندوستانی ہائی کمشنر کی حیثیت سے جا رہا تھا۔ سبیتا بھری محفل میں اس طرح چمکتی پھر رہی تھی جیسے موسم بہار میں کوئی بلبل۔

نوجوان نگاہیں اس جیتے جاگتے فتنے پر اس طرح للچائی ہوئی پڑ رہی تھیں کہ بس چلے تو آپس میں بانٹ کھائیں، لیکن شوکت کی فدویانہ رومان پسندی ان سب سے مختلف تھی۔ وہ کسی بھی زیادہ خوبصورت لڑکی سے اتنی جلد متاثر ہوتا جتنی جلد بندوق کی ایک گولی لگنے سے کوئی بھاگتا خرگوش گرے۔ ویسے فطرتاً وہ خرگوش سے زیادہ مختلف تھا۔

پھولا ہوا سا ۲۵ سال کا ایک بھولا بچہ، لیکن فطرت کا بہت نرم و نازک۔ وہ اتنا زودِ حساس تھا کہ دل کی معمولی سی چوٹ اسے اپنی کار سمیت خودکشی کر لینے پر اکسانے لگتی اور ذہن ہی ذہن میں وہ خودکشی کرتا ہوا وہ اپنے گھر پہنچ کر معمول سے زیادہ کھانا کھا ڈالتا اور کئی گھنٹوں تک خراٹوں کی گہری نیند سوتا رہتا۔

خان کو بھی اس دعوت میں مدعو کیا گیا تھا، لیکن بالے کو اکیلے ہی آنا پڑا، کیونکہ آج دوپہر سے ہی خان دفتر میں موجود تھا نہ بنگلے پر۔ سبیتا کو بالے نے بھی پہلی بار دیکھا تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ وہ بار بار دیکھنے جانے کے قابل ہی تھی۔ پھر بیچارے شوکت کا کیا قصور جو وہ پہلی ہی نظر میں ڈھیر ہو کر رہ گیا۔

"بالے بھائی، اللہ قسم اپنی ہے۔ دیکھو نظر وظر مت لگانا۔"

شوکت نے بڑے بھولے پن سے سبیتا پر اپنی پسند کا حق جتایا۔ لیکن بالے خود بھی اس وقت شوکت کو بھول کر سبیتا کو ہی دیکھ رہا تھا۔ شوکت کے نتھنے پھول گئے۔ اس نے کھا جانے والی نظروں سے بالے کو دیکھا اور پھر غصے میں کافی کی پیالی اس زور سے میز پر پٹکی کہ آس پاس کی دو چار میزوں پر بیٹھنے والے بھی چونک پڑے۔ پیالے سے کافی چھلک کر خود شوکت کی پتلون کا حلیہ بگاڑ چکی تھی اور وہ کھسیائی ہوئی نظروں سے کبھی اس کافی کو اور کبھی ان آس پاس کے لوگوں کو دیکھ رہا تھا، جو اسے اس کیفیت میں دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

Akram Allahabadi

"بالے بھائی، میں الو کا پٹھا کچھ فرما رہا ہوں۔" شوکت نے جل کر اسے بازو سے جھنجوڑا۔

"اف فوہ، کباب میں ہڈے۔" بالے نے مصنوعی جھنجلاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ شوکت کا فرمانا اب گھسیاہٹ میں تبدیل ہو گیا۔

"کون ہڈا؟... میں؟... ہڈے تم خود۔ پرائی بہو بیٹیوں کو گھورتے ہوئے شرم نہیں آتی۔" شوکت نے ناصحانہ انداز اختیار کر لیا۔

"تمہاری بہو بیٹیاں ہیں کیا؟" بالے نے آہستہ سے اسے جلانے والے لہجے میں پوچھا۔

"ہونگی تمہاری... ہونہہ... گلفام سمجھتے ہیں اپنے آپ کو۔ یہ چوکھٹا اور پریوں کے خواب۔" شوکت چلے دل کے پھپھولے پھوڑنے لگا۔ بالے مسکرا دیا۔

"تو کیا میں تمہارے لیے اپنی آنکھیں پھوڑ لوں؟"

"تم کیا پھوڑو گے، پھوڑے کا اللہ میاں۔ تم جیسوں کو اندھا ہی پیدا ہونا چاہیے۔"

"کوے کے کوسنے سے ڈھور نہیں مرا کرتے، بیٹے۔"

"بیٹا ویٹا مت کہو مجھے۔ میں تمہارا کوئی نہیں ہوں، اتنا سا بھی نہیں۔" شوکت نے چٹکی کے اشارے سے اتنا سا کی تشریح کر دی۔

"وہ تو تمہاری شکل پر تھوکے بھی نہیں۔" بالے نے اسے اور چڑھا دیا۔

"کون...؟ وہ...؟ جلن میں اب جو بھی کہہ لو۔ میں تو اتنی دیر سے گھورتی آئی تھی۔"

یہ کہتے ہوئے شوکت نے ایک بار سیتا کی طرف اس شان سے دیکھا جیسے وہ اپنے دعوے کی تصدیق طلب کر رہا ہو۔

"صاب، سینڈوچ۔" ایک بیرے نے درمیان میں آ کر ٹرے سامنے کر دی اور شوکت کی نظروں کے سامنے پہاڑ حائل ہو گیا۔

Akram Allahabadi

''نہیں چاہیے کچھ سینڈو وینڈ و۔'' شوکت نے بیرے کو ڈانٹ دیا اور وہ ایک مسکراتی نظر اس پر ڈالتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

''کون صاحب ہیں یہ؟'' دوسری میز پر بیٹھے ہوئے ایک خوش پوش خوبصورت سے آدمی نے شوکت کی طرف اشارہ کر کے بیرے سے پوچھا۔

''مگج پھریلا مالوم ہوتا ہے صاب کا۔'' بیرا اس استفسار پر دوبارہ شوکت کو دور سے گھور کر اس سے بولا۔ اور پھر اس آدمی کی نگاہیں شوکت کی عشقیاتی ہوئی نظروں کی سیدھ، یعنی سبیتا کے چہرے تک جا پہنچیں۔ وہ مسکرا کر اپنے ہمنشین کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر دونوں ہنس دیے۔

سبیتا خود ہر میز پر جا کر مہمانوں کی مزاج پرسی کر رہی تھی۔ شاید مسکراتے رہنا بھی اس کی عادت میں داخل تھا، کیونکہ اس کی مسکراہٹ رسمی نہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ ایک ایسا کھلا ہوا پھول معلوم ہوتی تھی جس نے بہاروں کی آغوش میں ہی آنکھ کھولی ہو اور جسے شاید اب تک کانٹوں سے واسطہ نہ پڑا ہو۔ اس کے حسین چہرے کی تازگی، اس کے صحت مند بدن کا تناسب اور اس کے مزاج کا چنچل پن سب کچھ ایک ایسی کشش کے حامل تھے جو دلوں کو برما دے لیکن بالے کا عالم اس وقت اس بھوکے سے مختلف نہ تھا جس کے سامنے کوئی نفیس مٹھائی رکھ کر اسے حکم دیا گیا ہو کہ ہاتھ نہ لگائے اس پارٹی میں اسے خان نے ہی بھیجا تھا۔ پارٹی کا دعوت نامہ دینا ناتھ رائے کی طرف سے خان کو ہی اس اصرار کے ساتھ بھیجا گیا تھا کہ وہ شریک نہ ہوا تو رائے صاحب کو افسوس ہوگا، لیکن خان نے دعوت نامہ بالے کے حوالے کر دیا تھا اور اس سے کہہ دیا تھا کہ شاید میں شرکت نہ کر سکوں گا، تم ہی چلے جانا۔ ویسے اگر مجھے موقع ملا تو کسی وقت بھی پہنچ سکتا ہوں۔ شوکت یہاں پہلے سے ہی موجود تھا۔ اپنی حیثیت و کاروبار کی وجہ سے وہ بھی معززینِ شہر کی سوسائٹی میں شمار ہوتا تھا۔ اسے اس پارٹی کا دعوت نامہ ٹھیکیداروں کی ایسوسی ایشن کے صدر کی طرف سے ملا تھا اور پارٹی وارٹی سے تو اسے خاک دلچسپی ہوتی، البتہ حسین

چہروں کی کشش اسے یہاں کھینچ لائی تھی ۔اسے کیا خبر تھی کہ سارجنٹ بالے بھی موت کے فرشتے کی طرح یہاں پہنچ جائے گا۔

''کسی چیز کی ضرورت ہو تو تکلف نہ فرمایئے گا۔'' سبیتا شوکت کے پاس والی میز پر بیٹھے ہوئے ایک ادھیڑ عمر کے مہمان سے کہہ رہی تھی، جو اپنی فیشن زدہ بوڑھی مسز کے ساتھ کسی قدر شرمائے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے۔ان کی مسز بوڑھی گھوڑی لال لگام کی مصداق بنی، اپنی سرخ بنارسی ساڑی میں خشک چقندر نظر آ رہی تھیں۔

''ضرورت...؟شوکت نے زیرِلب دہرایا۔''ہائے،ان سے کوئی کہہ دے کہ یہاں تو ضرورتِ رشتہ ہے۔'' وہ ٹھنڈی سانس کھینچ کر بولا۔

''گھبراؤ نہیں، وہ ادھر ہی آ رہی ہے، خود ہی کہہ ڈالو۔'' بالے نے اس کی اس کیفیت پر برا سا منہ بنا کر کہا۔

''وہ برا تو نہیں مانے گی، بالے بھائی ؟''شوکت نے لہجہ خوشامدی بنا کر بالے سے پوچھا۔

''اس میں برا ماننے کی کون سی بات ہے؟ آج کل کی لڑکیاں منہ پھٹ مردوں کو زیادہ پسند کرتی ہیں۔''

''اللہ قسم؟''شوکت نے امید افزا لہجے میں نیم یقینی استفسار کیا۔

''تو کیا جھوٹ کہتا ہوں، بودم۔''بالے نے جھنجلاہٹ کا اظہار کیا۔

''تم خود وہ...کیا...؟یعنی کہ بودم وودم۔''شوکت کو غصہ آ گیا۔

''ارے ارے، کیا گرمی چڑھ گئی ہے؟''

''گرمی گئی تیل لینے،ایسی جگہ انسلیٹ کی تو دو دو ہاتھ ہو جائیں گے۔بہت سہہ لیا، باس۔''شوکت بس کو لمبا کھینچ کر بولا۔

''کیا سہہ رہے تھے؟''بالے نے مسکرا کر پوچھا۔

''انڈے...جاؤ..بول دیا، ہاں۔''شوکت کی کھوپری آؤٹ ہوگئی، لیکن اسی وقت سبیتا ان کی میز کے نزدیک آ گئی۔

''بالے بھائی، لو، تمہارے ہاتھ جوڑے۔''شوکت نے میز کے نیچے سے بالے کا ہاتھ دبا کر آہستہ سے التجا کی۔ وہ شوکت کی طرف مخاطب ہونے ہی جا رہی تھی کہ بالے کو بے اختیار چھینک آ گئی۔ اس چھینک کا ردِعمل شوکت پر کچھ ایسا غیر متوقع ہوا کہ وہ بوکھلا گیا اور بجائے بالے پر بگڑنے کے سبیتا پر بگڑ پڑا۔

''یار، خدا تمہیں غارت کرے، کیا بھنگ میں رنگ ڈال د...اررر...لاحول ولاقوۃ۔ یعنی کہ آپ سے نہیں...مم...میں تو...ان سے...قہہ...''شوکت کے ہاتھ کی انگلی کانپ کر بالے کی طرف مڑ گئی اور سبیتا اس کی گھبراہٹ پر مسکرا دی۔

''تو کیا بھنگ میں رنگ پڑ گیا ہے؟''وہ اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی۔

اس کی ایک پستہ قد، لیکن گٹھیلے جسم والی سہیلی بھی جو عمر میں ۲۲۔۲۳ ہی معلوم ہوتی تھی، پیچھے آ کھڑی ہوئی تھی۔

''کہاں؟''شوکت نے احمقوں کی طرح گھبرا کر کہا۔''بھنگ؟ نن...نہیں تو۔''وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا اور اس بار سبیتا اور اس کی سہیلی دونوں قہقہہ مار کر ہنس پڑیں۔ بالے مسکرا رہا تھا اور جب شوکت نے دیکھا کہ بالے کی مسکراہٹ اور سبیتا کے قہقہے میں نگاہوں کے تصادم کا ایک رشتہ قائم ہو گیا تو اس کی شہ رگ تک سلگنے لگی۔

''آپ میمانوں کا مقاق...ہشت سالی زبان۔''اس نے زیرِ لب اپنی زبان کو گالی دی۔''یعنی کہ مزاخ...اڑاتی ہیں۔''وہ سبیتا کے ہنستے ہنستے سرخ ہو جانے والے چہرے کو اپنی محبت سے یتیم نظروں سے تکتے ہوئے یاس انگیز لہجے میں بولا۔

''یہ غلط فہمی کیسے ہوگئی، جناب، آپ کو؟''سبیتا کی سہیلی نے شوکت کو سنبھالنے کی کوشش کی۔''ہم لوگ تو آپ کے ساتھی کی بے وقوفی پر ہنسے تھے۔''جملے کا دوسرا ٹکڑا اس نے

اس قدر آہستہ سے سرگوشی کے لہجے میں ادا کیا کہ جسے صرف شوکت ہی سن سکے اور اس جملے نے گویا شوکت کے لیے مسیحائی کا کام کیا۔ اس کا چہرہ کھل کر سرخ ہو گیا۔

''سچ؟'' اس نے بڑے بھولے پن سے اسی سرگوشی کے پیرائے میں اس لڑکی سے پوچھا۔

''آپ کے سر کی قسم۔'' وہ سیتا کو آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ اور شوکت کے تمام جسم میں ایک سرسراہٹ سی دوڑ گئی۔ اسے جھرجھری سی آ گئی۔ اس نے گردن گھما کر بالے کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے سکندر پورس سے پوچھ رہا ہو، 'بیٹے، اب کیا سلوک کیا جائے تم سے؟' لیکن سیتا کو بالے سے ہم کلام دیکھ کر اس کے چیلنج پر اوس پڑ گئی۔ ان کی یہ گفتگو اس قدر مہذب پیرائے میں ضرور تھی کہ دوسری میزوں کے مہمان ان کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔

''بھئی سیتا، میں تو یہیں بیٹھوں گی۔ یہ صاحب بڑے دلچسپ ساتھی معلوم ہوتے ہیں۔'' سیتا کی سہیلی نے شوکت کے پاس والی کرسی پر جمتے ہوئے سیتا سے کہا اور سیتا نے مسکرا کر صرف گردن ہلا دی۔ بالے اس سے کہہ رہا تھا۔

''بڑا نہ مانیے گا، میں بڑی مشکل سے انھیں دس سال بعد آگرے کے پاگل خانے سے نکلوا کر لایا ہوں۔ ویسے آدمی بالکل بے ضرر ہیں۔'' سیتا ایک بار پھر شوکت کو دیکھ کر مسکرا دی۔ لیکن قبل اس کے سیتا کوئی جواب دے، دائیں طرف سے کسی کے کھنکھارنے کی آواز نے انھیں چونکا دیا۔ وہ دینا ناتھ رائے تھے۔

''بیٹی، تم یہاں ہو۔'' مسٹر رائے نے سیتا کو مخاطب کیا۔ ''وہ کپتان صاحب آ گئے ہیں۔'' وہ بولے۔

سیتا ایک دم چونک پڑی اور اس کی آنکھوں میں کپتان صاحب کا نام سنتے ہی ایک عجیب سی چمک پیدا ہوتے دیکھ کر بالے کے دل کے دروازے پر الو دستک دینے لگا۔ سیتا فوراً ہی پلٹ پڑی، لیکن بالے نے ایسا منہ بنایا جیسے اسے قے آتے آتے رہ گئی ہو۔ پھر اس نے

چور نظروں سے دیکھا شوکت سیتا کی سہیلی سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے اسے کنکھیوں سے گھورتا جا رہا تھا۔

''بعض لوگ بڑے بے غیرت ہیں، مس...'' وہ اس لڑکی سے کہہ رہا تھا۔

''میں پھر سے بتا دوں، میرا نام نیلم ہے۔''

''جی ہاں، جی ہاں۔ سمجھ گیا۔ وہ پکھراج والا نیلم۔'' شوکت نے اس کے نام کی یاد آوری کے لیے اپنی بھونڈی سی مثال بھی قائم کر دی۔ سیتا کی سہیلی ہنس پڑی۔

''خدا کسی کو عقل سے پیدل نہ بنائے۔'' بالے منہ پھیر کر بڑبڑایا۔

شوکت کا خون تو کھول گیا، لیکن ہم نشین ایک خوبصورت لڑکی تھی جس کے سامنے خود کو از قسم فدوی ظاہر کرنا ہی اس کے نزدیک عین شرافت تھی، اس لیے ضبط کر کے رہ گیا۔

''آپ نے کبھی کسی سے عشق کیا ہے؟'' نیلم نے بلا جھجک شوکت سے سوال کیا اور وہ اس عجیب سے استفسار پر سٹ پٹا سا گیا۔

''عشق... جج... جی ہاں... یعنی کہ آپ سے پہلے کسی سے نہیں۔'' وہ بغیر سوچے سمجھے بول اٹھا۔

''تو کیا آپ کو مجھ سے عشق ہو گیا ہے؟'' اس نے زہد شکن رومان انگیز نظروں سے شوکت کو گھر کر سوال کیا اور شوکت اس سے نظریں ملا کر خود ہی جھینپ گیا۔

''ہو گئے بیٹا ریشہ خطمی۔'' بالے کے الفاظ شوکت کے کانوں سے ٹکرائے تو آہستگی سے، لیکن اسے ایسا محسوس ہوا جیسے سوئیاں چبھ گئی ہوں۔

''ہاں... جاؤ... ہو گئے۔'' وہ بالے کی طرف پلٹ کر بگڑے ہوئے لہجے میں بولا، لیکن بالے اس کی طرف مخاطب ہی نہیں تھا۔ وہ ہال میں ان صوفے والی نشستوں کی طرف گھور رہا تھا جن پر بعض مخصوص ہستیاں براجمان تھیں۔ ان میں سے بعض چہرے اس کے جانے پہچانے تھے۔ ایک تو خود دینا ناتھ رائے تھے، دوسرے ان کا وہ داماد جو سفیر بنا کر بھیجا جا رہا تھا،

تیسری شخصیت ایک کھدر پوش بزرگ تھی۔ یہ حضرت اپنے قد وقامت اور جسامت سے ہی بزرگ تھے، ویسے ضرورت سے زیادہ چربی چڑھا ہوا ان کا تقریباً تین ٹن کا جسم، گلوکوز کے دودھ پر پھول جانے والے کسی بچے کے جسم کی طرح پھولا ہوا تھا۔ چہرے کے موٹاپے میں آنکھیں مختصر ہو کر گڈھوں میں چھپ گئی تھیں اور جبڑوں پر چڑھا ہوا گوشت کسی بلڈاگ کی طرح نیچے کی طرف لٹک آیا تھا۔ یہ یہاں کے ایک نیک نام سیاسی مخیّر لالہ دھن راج تھے جو کانگریسی اس لیے تھے کہ حکومت کانگریس کی تھی اور سفید کھدر تن اور من دونوں کے کالے پن کو چھپانے کے لیے کافی تھا۔ اور سیاسی مخیّر اس لیے کہ وہ اپنی کالے بازار کی آمدنی پر جو دھرم دان نکالتے تھے وہ قومی بھلائی کے نام پر الٹے سیدھے کام کرنے والے بعض بڑے بڑے نیم قومی نیم شخصی اداروں کو اخبار والوں کے سامنے چندے میں دے دے کر اپنی قوم پرستی اور ہر دلعزیزی کا خوب پروپیگنڈہ کراتے تھے۔ ان کی مقبولیت کا راز وہ ٹی پارٹیاں ہوتیں جو خاص طور سے پریس رپورٹروں کو دی جاتیں اور رپورٹر بیچارے پارٹیوں میں لالہ جی کا نمک کھا کر اپنے دفتر میں جا کر اسے اخلاقاً یا مروتاً حلال کر دیتے۔ لالہ جی نے اخبار والوں کی دکھتی رگ پکڑ لی تھی، اور وہ تھی ان بیچاروں کی شرافت، ان کی مروت پسندی۔ آج اسی وجہ سے لالہ جی اصل ذات کے سفید مرغے بنے مہمان خصوصی کی حیثیت سے بیٹھے تھے۔ دو ایک پریس رپورٹروں کو جو لالہ جی کی دان پسندی کے زیادہ مداح تھے اور جن کا تعلق معمولی اخباروں سے ہی تھا، وہ یہاں بھی اپنے ساتھ لیتے آئے تھے۔ حالانکہ دینا ناتھ رائے یقیناً ان سے کوئی چندہ طلب کرنے والے نہ تھے۔

بالے ان ذاتِ شریف کو دوسری جگہوں پر بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ ان سے جتنا اچھی طرح واقف تھا، اسی قدر وہ ان کی شکل سے نفرت بھی کرتا تھا اور دل ہی دل میں اس نے یہ طے کر رکھا تھا کہ لالہ جی کے کالے بازار کے پیچھے کسی نہ کسی دن وہ ضرور پڑ کے ان کا منہ بھی کالا کروائے گا۔

چوتھی شخصیت ایک ایسے آدمی کی تھی جو بالے کے لیے تو نیا ہی تھا۔ وہ کھچڑی بالوں والا اچھے قد و قامت کا ہنس مکھ سا آدمی تھا، لیکن اس نے اس ٹھنڈی جگہ بھی آنکھوں پر سیاہ شیشوں والی عینک لگا رکھی تھی۔ بالے کچھ دیر تک اسے غور سے دیکھتا رہا، لیکن جب اسے پہچان نہ سکا تو اس نے نگاہیں داخلی دروازے کی طرف پھیر لیں۔ لیکن اس وقت اس کے سینے پر سانپوں کی جگہ اژدھے لوٹنے لگے، جب اس نے سیتا کو ایک خوبصورت وجیہہ آدمی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ وہ مراد نہ حسن کا ایک پرکشش نمونہ تھا۔ بھرا بھرا سرخ و سفید چہرہ، پتلی لمبی ناک، خوبصورت آنکھیں، کشادہ پیشانی اور ملائم سلجھے ہوئے بال۔ اس کے کاندھے کافی چوڑے اور جسامت صحت مند تھی۔ وہ ہاتھ میں کریون اے سگریٹ کا ڈبہ دبائے ہوئے تھا۔ اس کے بدن پر گہرے صندلی رنگ کا گرم سوٹ تھا اور پیروں میں اسی رنگ کے سانبھر کے چمڑے کے جوتے۔

وہ غالباً وہی کپتان تھا جس کے لیے دینا ناتھ نے اپنی بیٹی کو اطلاع دی تھی۔

پارٹی کے دوران ہی دینا ناتھ رائے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے سب سے پہلے مہمانوں سے لالہ دھن راج کا تعارف کرایا اور جن شاندار الفاظ میں ان کا تعارف کرایا گیا، ان کے مستحق وہ ہوں یا نہ ہوں، لیکن بالے ان کی تعریف پر بڑبڑائے بغیر نہ رہ سکا۔

پھر خود سیتا نے کپتان کا تعارف مہمانوں سے کرایا۔

''آپ ہیں کیپٹن وجے کمار بوس۔'' وہ مسکراتی ہوئی بولی۔

''وردی کیا بیچ کھائی؟'' حاضرین میں سے کسی نے دور سے کہا، جس پر سارا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا، لیکن کپتان کے ماتھے پر بل نہ آیا، وہ بدستور مسکراتا رہا۔

''کبھی تھا فوج میں۔ اب تو میں بزنس کرتا ہوں۔'' کپتان نے جواب دیا۔

''خیر، خدا برکت دے۔'' دوسری طرف سے کسی نے کہا۔ جس پر پھر بہت سے قہقہے گونج اٹھے۔

Akram Allahabadi

لیکن اسی وقت بالے اپنے کانوں کے نزدیک کسی کی سرگوشی کرتی ہوئی آواز سن کر چونک اٹھا۔

''کپتان کا پیچھا کرو، بہت احتیاط سے۔''

آواز یقیناً خان کی تھی، مگر بالے نے جب پلٹ کر دیکھا تو اسے ایک آدمی ہال کے دروازے کی طرف بڑھتا نظر آیا، جس کی پشت اب بالے کی طرف تھی۔ وہ اتنی تیزی سے ہال سے نکل گیا کہ بالے اسے زیادہ غور سے دیکھ بھی نہ سکا، البتہ اس نے چاروں طرف نظریں گھما کر یہ ضرور دیکھ لیا کہ کسی کی توجہ اس آدمی کی طرف نہ تھی۔

کپتان اب ایک میز پر سبیتا کے ساتھ جا بیٹھا تھا۔ سبیتا کا بہنوئی تو چند سیاست داں قسم کے مہمانوں سے مصروفِ بحث تھا، دینا ناتھ رائے کرنل شمشیر سنگھ سے شکار کے مسئلے پر الجھے ہوئے تھے اور سبیتا کپتان کی تواضع کر رہی تھی۔ اس کے اندازِ تکلم اور بار بار کی شرمیلی مسکراہٹ سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کپتان کی خوبصورت شخصیت سے کافی متاثر ہے۔ بالے دل ہی دل میں کپتان کو بہت سے گھونسے دکھا رہا تھا۔

سبیتا اس کی میز پر ہوتی تو کتنا لطف آیا ہوتا۔ اسے خان پر غصہ آنے لگا جو اس نے یہ حکم نہ دیا کہ کپتان کو گولی ماردی جائے۔ شوکت کا ساتھ بھی اب اسے بور ہونے لگا تھا۔ شوکت نیلم کے فی الفور عشق میں تقریباً غرق ہو چکا تھا۔ اسے اس بات کا بھی ہوش نہ تھا کہ بالے اس کے سامنے والی نشست پر ہے بھی یا نہیں۔

کچھ دیر بعد مہمانوں نے مبارکبادی کی تقریریں شروع کر دیں۔

''تو آپ سے پھر کہاں ملاقات ہوگی؟'' شوکت نے جسارت کر کے نیلم سے پوچھا۔

''مجھ سے؟'' وہ مسکرائی۔ ''اس دنیا سے لے کر دوسری دنیا تک۔''

''آپ تو نالم ٹول کر رہی ہیں۔'' شوکت نے بچوں جیسا منہ بنالیا اور نالم ٹول پر نیلم

کے لبوں سے دبا ہوا سا قہقہہ نکل گیا۔شوکت جھینپ سا گیا،لیکن جب اس نے پلٹ کر بالے کی طرف دیکھا تو یہ دیکھ کر اس کے سینے سے پہاڑ ٹل گیا کہ بالے کی نشست خالی تھی۔

''ہیلو،ڈارلنگ۔تم یہاں ہو۔''ایک آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا۔

نیلم کے پیچھے آ کر کھڑا ہوانے والا آدمی تندرست، ہنس مکھ اور لباس سے خاصا شاندار معلوم ہوتا تھا۔نیلم اسے دیکھ کر مسکرا دی اور شوکت کا فرطِ رقابت سے برا حال ہو گیا۔

''غاپ کی تعریف؟''اس نے جوش وغضب سے حلق میں اٹکتی آواز میں پوچھا۔

''یہ میرے شوہر ہیں،مسٹر کامدار۔''نیلم نے آنے والے کا ہاتھ تھام کر ہنستے ہوئے شوکت سے تعارف کرایا۔

''شوفر؟''شوکت نے اپنے تئیں غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہوئے پوچھا۔

''اوہ...ہا ہا ہا...''کامدار کا قہقہہ چھوٹ گیا۔''بھئی، بہت خوب۔''اس نے اپنا بھاری ہاتھ شوکت کی پیٹھ پر رکھ دیا۔

''مائی ہزبینڈ۔''نیلم نے انگریزی میں سمجھایا۔

''یعنی کہ آپ...؟ آپ یعنی کہ...؟میرا مطلب ہے کہ یہ...''شوکت بوکھلا اٹھا۔

''ڈیئر،مسٹر شوکت بہت دلچسپ دوست ہیں۔''وہ اپنے شوہر سے کہنے لگی۔

''دوستی کی تو...''شوکت زیرِ لب بڑبڑایا۔پھر اس نے بے غیرتوں کی طرح دانت کھول دیے۔

''جی، کچھ فرمایا آپ نے؟''

''یعنی کہ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔''

''اوہ۔''وہ مسکرایا۔''امید ہے کہ ہم پھر ملیں گے۔چلو،ڈیئر۔''

نیلم کے شوہر نے اپنی شریکِ حیات کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

''خدا نہ ملائے تم سے۔''شوکت ان کے ہٹتے ہی برا سا منہ بنا کر بڑبڑایا۔

Akram Allahabadi

پارٹی ختم ہوگئی اور مہمان میزبانوں سے مل کر رخصت ہونے لگے۔شوکت آج شدت سے بور ہو چکا تھا۔اسے اس وقت بھی یہ گمان مشتعل کر رہا تھا کہ ضرور یہ بالے کی شرارت ہوگی جو ایک شادی شدہ لڑکی سے اس کا مذاق اڑوایا گیا۔عالمِ خیال میں وہ بالے کو گھونسہ دکھاتا ہوا ہال کے باہر نکل آیا۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

سیاہ سایہ

شام ڈوبنے کے باوجود تیرھویں کے چاند نے کائنات کو روشن کر رکھا تھا اور ان تاریخوں کی چاندنی ویسے بھی کافی رومان انگیز ہوتی ہے۔

کپتان بوس کی سرخ ڈاج کار، مضافاتی پاتھوے نمبر ۱۰۳ کو عبور کرتی ہوئی ماؤنٹ پیری پر چڑھنے لگی۔

ماؤنٹ پیری، شہر سے تقریباً ۲۰ میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی تفریح گاہ تھی۔ یہ پہاڑی زیادہ اونچی تو نہ تھی، لیکن اپنے محل وقوع کے اعتبار سے رومان پسند جوڑوں کے لیے اس سے بہتر اور خوش گوار مقام شاید ہی کوئی ہوسکتا۔ ویسے فاصلے کی وجہ سے لوگ بہت کم ہی ادھر آتے اور خاص طور پر جب سے ڈونگرا جھیل میں بہتی لاشیں پائی گئی تھیں، شہر کے تفریح پسندوں نے ادھر کا رخ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ ان وارداتوں کے بعد سے اس جھیل کے ساتھ طرح طرح کی آسیبی روایات منسوب کی جانے لگی تھیں۔ اس وقت بھی ماؤنٹ پیری کی اونچائی پر جانے والی سڑک ویران پڑی تھی۔

کیپٹن بوس کار ڈرائیو کر رہا تھا اور اس کے پاس والی نشست پر سبیتا کریم کلر ساڑی میں ملبوس آفاقی حور نظر آرہی تھی۔ اس نے جوڑے میں موسمی سرخ پھول لگا رکھے تھے جو دور سے انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ کیپٹن بوس کا ایک ہاتھ کبھی کبھی اسٹیئرنگ سے بہک کر سبیتا کے دوسرے بازو تک پہنچ جاتا۔ وہ اسے جذبات میں ڈوبی ہوئی نظروں سے دیکھ کر مسکرانے لگتی۔

سارجنٹ بالے نے اگر اپنی موٹر سائیکل میں سائلنسر نہ لگوا رکھا ہوتا تو شاید انھیں احساس ہوجاتا کہ کوئی اور بھی ان کے پیچھے آرہا ہے۔ لیکن انھیں نہ تو اس کی خبر تھی اور نہ شاید خود

اپنی۔بالے نے پہاڑی کے موڑ پر اپنی موٹر سائیکل اتنی آہستہ کردی کہ بوس کی کار کے بیک رفلیکشن گلاس میں بھی اس کا عکس نظر نہ آسکے۔کار کے دوسرے موڑ پر گھوم جانے کے بعد پھر اس کی موٹر سائیکل کی رفتار تیز ہوگئی۔

پہاڑی کی سطح مرتفع تھی۔اوپر سے یہ ایک چھوٹا سا میدان نظر آتا جس پر جگہ جگہ برجھڑی کی زمین گرفت جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اوران میں جنگلی تیتروں نے انڈے دے رکھے تھے۔راستے میں بالے کو کئی خرگوش بھی ملے جو پہلے تو کسی ٹرافک مین کی طرح راستہ روکے رہے،لیکن جب انھیں دوپہیوں کے اس خونخوار دیو کی آمد کا احساس ہوا تو میدان چھوڑ کر بھاگ اٹھے۔

وہ دونوں اسے پہاڑی کی اوپری ہموار سطح کے مشرقی کنارے پر نظر آگئے۔وہ ایک چٹان کے سہارے کھڑے پہاڑ کی کھلی ہوا میں آہستہ آہستہ باتیں کررہے تھے۔ان کی گفتگو کا انداز اوراس کے ردِعمل میں ان کے چہروں پر ابھرنے والے جوشیلے شرمیلے اور جذباتی تاثرات اس بات کے غماز تھے کہ سلسلہ گفتگو رومانی ہے۔

بالے موٹر سائیکل کو برجھڑی کی جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں لٹا کر ایک چٹان کی آڑ میں پتھر سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگیا۔وہ اس وقت شدت سے بور ہورہا تھا۔ایک تو کیپٹن بوس اور سیتا کے رومان کا یہ ڈرامہ خود اسے کسی کیفے کی خوشگوار شام کی یاد دلا رہا تھا،اس پر سے یہ ستم ظریفی کہ نہ جانے کب تک یہ سلسلۂ عشق دراز چلتا رہے۔اوراسے اس کا نظارہ کرکے اپنے ارمانوں کا خون کرنا پڑے۔اس کا خیال صحیح نکلا۔وہ لوگ ٹلنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔بالے کو تصور میں کئی خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ بال رقص کرتے کرتے نصف گھنٹہ گزر گیا،لیکن بے سود۔وہ لوگ اب تک وہیں موجود تھے۔وہ اب اسی چٹان سے ٹک کر بیٹھ گئے تھے اور شاید چاند کے شفاف آسمان میں تیرنے کا نظارہ کررہے تھے۔بالے نے بڑبڑاتے ہوئے سر کو جھٹکا اور فرائض کی اس قسم کو موٹی موٹی گالیاں دیتا ہوا اپنی موٹر سائیکل کے پاس آگیا۔موٹر سائیکل

میں کمیونیکیشن سیٹ لگا ہوا تھا، کو علیحدہ سے نصب کردہ بیٹری سے آپریٹ کیا جاتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ خان اگر گھر پر موجود ہوا تو تاوقتیکہ وہ اپنے اسٹڈی روم میں نہ جائے، کوشش بے سود ہوگی۔ خان کا خفیہ رسیونگ سیٹ اس کے اسٹڈی روم میں ہی نصب تھا۔ ویسا س کی کار میں بھی وائر لیس سیٹ لگا ہوا تھا، لیکن اس وقت زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ خان گھر پہنچ چکا ہوگا۔

خوش قسمتی سے انڈیکیشن سوئچ کے تیسرے روؤنڈ پر ہی اس کو جواب مل گیا۔ خان اسٹڈی روم میں ہی موجود تھا۔

"ہیلو.... لیں... خان ہیئر۔"

"ہیئر... ہیئر... ہپ ہپ۔" بالے کے منہ سے نکل گیا۔

"کیا بکنا ہے، جلدی بولو۔" خان اس کی آواز پہچان کر بولا۔

"کیو؟ کیا آپ بہت بزی ہیں؟"

"ہاں۔ تم کہاں سے بول رہے ہو؟"

"زمین اور آسمان کے درمیان سے۔"

"جلدی بولو، مجھے ضروری کام ہے۔"

"بہتر ہے۔ عرض یہ کرنا ہے کہ میں آپ کی ہدایت کے مطابق اس الو کے پٹھے، یعنی کہ کپتان بوس کا تعاقب دعوت کے بعد سے کرتا ہوا اس مقام تک پہنچا ہوں جو ۳۶۵ ڈگری عرض البلد اور ۳۶۵ ڈگری طول البلد پر زمین سے ایک ہزار فٹ اوپر اور آسمان سے کئی ہزار میل نیچے کچھ مشرق میں، کچھ مغرب میں واقع ہے اور لوگ اسے بوڑھاپے کا پہاڑ کہتے ہیں، وغیرہ وغیرہ..." بالے نے اتنی تیزی سے بولنا شروع کیا کہ سننے والے کے پلے کچھ بھی نہ پڑے۔

"شامت آئی ہے کیا؟"

"ارے واہ، خود ہی کہا کہ جلدی بولو اور خود ہی..."

''صرف دو منٹ اور دے سکتا ہوں تمہیں۔''

''دراصل کام کی بات یہ ہے کہ آپ کا یہ وفادار نا ہنجار خدمت گزار یہاں بیٹھے بیٹھے بڑی شدت سے بور ہو رہا ہے۔ اور وہ دونوں ایک چٹان کی آڑ میں رومانس فرما رہے ہیں اور بالے صاحب کے سینے پر سانپ گجا، اژدھے لوٹ رہے ہیں۔''

''مجھے ذاتیات سے کوئی سروکار نہیں، نتیجہ بتاؤ۔''

''نتیجہ کار بد کا کار بد ہے۔''

''لاحول ولاقوۃ۔ تم یوں نہ مانو گے۔''

''آپ وائرلیس پر مجھے زیادہ سے زیادہ ایک موٹی سی گاڑی، آئی ایم ساری، گالی دے سکتے ہیں۔''

''دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟''

''میری جگہ آپ بھی ہوتے تو یہی کیفیت ہوتی۔ اس قسم کی ڈیوٹی دینے سے تو بہتر ہے کہ آپ مجھے کسی بینک کی چوکیداری دلوا دیجیے۔''

''آخر تم کیا جھک مار رہے ہو وہاں؟''

''یہی تو کر رہا ہوں۔ وہ دونوں اطمینان سے رومان لڑا رہے ہیں اور یہ چڑی کا غلام آپ کے حکم کی تعمیل کر رہا ہے۔''

''کوئی خاص بات؟''

''قطعی نہیں۔ وہ سیدھے سیدھے لیلیٰ منجو... اونہوں نہہ، مجنوں معلوم ہوتے ہیں۔''

''خیر، ابھی اور انتظار کرو۔''

''لعنت ہے مجھ گدھے پر۔''

''بے شک۔'' یہ کہہ کر خان نے سلسلۂ کلام منقطع کر دیا اور اس بے تکی، غیر دلچسپ ڈیوٹی کی بوریت کا انتقام خان کا وقت خراب کر لینے کی بالے کی کوشش ناکام رہ گئی۔ وہ بے بسی

سے آسمان کی طرف رخ کر کے دعا مانگنے لگا۔

''اوپر والے، سب کچھ بنانا، لیکن کسی کو سارجنٹ بالے مت بنانا۔''

پھر وہ چٹان کی سے پیٹھ لگا کر مونجنی کے تصور میں کھو گیا۔ گوری گوری خوبصورت نوجوان لڑکیا، مغرب زدہ ہندوستانی سوسائٹی کے حسین تحفے اور امریکی دھنوں پر بے ہنگم ہندوستانی بال رقص۔ اس کا دماغ مغرب و شرق کے تضاد میں الجھ گیا۔

ایک ہندوستانی لڑکی یوروپین نہیں بن سکتی، نہ ایک یوروپین لڑکی ہندوستانی۔ پھر بھی مشرق میں کس قدر لچر قسم کی عریانیت پھیل رہی ہے۔ اس کے دماغ کی رو اس وقت ایک مصلح، ایک مشرقیت پسند رجحان کی طرف بڑھنے لگی تھی، لیکن پھر اچانک مونجنی کی خوبرو جوان لڑکیوں کی گوری گوری پنڈلیاں اس کے تصور میں تھرکنے لگیں اور وہ اپنے آپ پر مسکرا دیا۔

''تم کبھی پادری نہیں بن سکتے، بیٹے سارجنٹ۔'' وہ بڑبڑایا۔

لیکن ساتھ ہی وہ ان دو سایوں کو حرکت کرتے دیکھ کر چونک پڑا۔ وہ اب چٹان کے پاس سے ہٹ کر کھلی جگہ کھڑے تھے۔ وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھے۔ سیتا کی ساڑی کا پلو تند ہوا سے لہرا رہا تھا۔ اور شاید کپتان کی ٹائی بھی۔ بالے اس منظر کو دیکھتے دیکھتے اس شدت سے بور ہو چکا تھا کہ اب اس کا دل بے اختیار نارزن کی آواز میں کھلے بندوں نعرہ مارنے کو چاہ رہا تھا۔ لیکن وہ انھیں گھورتے گھورتے ٹھٹک گیا۔

ایک پراسرا سایہ، جو سر سے پیر تک سیاہ نظر آ رہا تھا، جس طرح کوئی سیاہ رنگ کا برقع پہنے ہو، بہت آہستہ آہستہ برجھری کی جھاڑیوں کی اوٹ سے گھٹنوں کے بل چلتا ہوا ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ بالے سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھا، لیکن چاندنی کی وجہ سے اس جگہ سے اسے دیکھا جا سکتا تھا۔ البتہ جھاڑیوں کی آڑ سے ان دونوں کی نظروں سے ضرور چھپا سکتی رہی ہوگی۔ اسے یقیناً کسی اور کی موجودگی کا یہاں احتمال نہ ہوگا، ورنہ وہ پشت سے اتنا غافل نہ ہوتا۔

بالے نے بھی یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کون ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے، پیٹ کے بل لیٹ کر آگے کی طرف رینگنا شروع کیا۔

کپتان اور سیتا اِن اَن جانے حالات سے قطعی غافل اپنی دھن میں کھوئے ہوئے تھے۔ ویسے رومان انگیز لمحات میں جہاں دو روحوں کا ارتباط ایک نئی زندگی کا سرور، عقل و دماغ پر طاری کیے ہو، ان کا ماحول سے بے تعلق ہو جانا فطری تھا۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ اس سُونے اور دور کے مقام پر کسی اور کے وجود کا انھیں احساس نہ ہو۔

''ڈیڈی دل کے بڑے اچھے ہیں۔ وہ ہماری خواہش کو رد نہ کریں گے۔'' سیتا کیپٹن سے کہہ رہی تھی۔

''اور تو کوئی خیال نہیں؟'' کپتان بولا۔ ''سوائے اس کے کہ کہیں ذات برادری کا جھگڑا نہ اٹھ کھڑا ہو۔''

''اوہ، قطعی نہیں۔ وہ پروگریسو آدمی ہیں۔'' سیتا نے اسی تردید کی۔

''تب تو کل میں...'' لیکن وہ اس سے زیادہ نہ کہہ سکا۔ اس سیاہ، نامعلوم سائے کا ہاتھ بلند ہو کر اس کے سر پر پڑ چکا تھا۔ وہ تیورا کر گر پڑا اور اس سے پہلے کہ سیتا کے لبوں سے چیخ نکل سکتی، اس کا منہ بند کیا جا چکا تھا۔ شاید وہ کسی طرح بیہوش کر دی گئی تھی، کیونکہ بالے کو یہ فیصلہ کرنے میں چند سیکنڈ تذبذب کرتے گزر گئے کہ اسے اسی وقت مداخلت کرنا چاہیے یا آگے پیش آنے والے حالات کا انتظار کرنا چاہیے۔ اس کے بعد وہ اس خیال سے دوڑ پڑا کہ کہیں سیتا خطرے میں نہ پڑ جائے۔ وہ سایہ اب اسے اپنے کندھے پر ڈال کر تیزی سے راستے کی سمت دوڑ رہا تھا۔

بالے بھرا ہوا پستول جیب سے نکال چکا تھا، لیکن بھاگتے ہوئے وہ اس پر فائر بھی نہ کر سکا، کیونکہ اس کیفیت میں اگر نشانہ خطا ہو جاتا تو گولی سیتا کو بھی لگ سکتی تھی۔ اس موقع پر اسے خان بے طرح یاد آ گیا۔ اس کا نشانہ ایک دوڑتے آدمی کے سر پر بندھے ہوئے سیب کو بھی

اڑا سکتا تھا۔اس سائے نے شاید اب تک بالے کو نہ دیکھا تھا۔عجلت کی وجہ سے شاید اس کا دھیان بھی اس طرف نہ ہو۔بالے یہ اندازہ کر کے کہ وہ واقعی اب تک اسے نہیں دیکھ سکا تھا، پنجوں کے بل اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔ان کے درمیان اب تقریباً سو قدم کا فاصلہ تھا۔وہ نامعلوم سایہ ضرور کافی مضبوط اور پھرتیلا تھا، کیونکہ وہ سبیتا کو کاندھے پر ڈالے ہوئے بھی اتنی تیز دوڑ رہا تھا کہ جیسے کوئی حمال روئی کی گٹھری لے کر بھاگ رہا ہو۔بالے چاہتا تو اس پر بھی دوڑ کر اس کے برابر پہنچ سکتا تھا، لیکن ایسا خطرناک اقدام کرنے والا کوئی بھی آدمی یقیناً غیر مسلح نہ رہا ہوگا۔اور عین ممکن ہے کہ اس کے ہاتھ میں بھی کوئی بھرا ہوا پستول ہی ہو۔اس صورت میں وہ بآسانی بالے پر گولی چلا سکتا تھا، جبکہ بالے کو سبیتا کی حفاظت کی خاطر یا تو ہاتھ روکنا پڑتا یا بچا بچا کر گولیاں چلانا پڑتیں۔

وہ اب آگے پیچھے دوڑتے سڑک پر نکل آئے تھے اور بالے کو یہاں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کپتان کی کار کے علاوہ اس کے پیچھے ایک کار اور موجود ہے۔یہ ایک سیاہ رنگ کی لمبی گاڑی تھی جس کا ہڈ پیچھے کی طرف سے صندوق نما اور انجن کا حصہ اور بانٹ لمبے تھے۔وہ یا تو رولس ہو سکتی تھی یا اطالوی ریسنگ کار لانسیا لیمبدا۔

جیسے ہی اس پراسرار سائے نے سبیتا کو اس گاڑی کی پچھلی نشست پر ڈالا، بالے وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس پر گولی چلا بیٹھا، لیکن گولی اس کی بجائے کار کی باڈی پر پڑی۔اتنی دیر میں وہ آدمی بندر جیسی تیزی سے اچھل کر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔

اس نے ایک ہاتھ سے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے بالے پر جوابی فائر کر دیا۔کار میں شاید اور کوئی نہ تھا، ورنہ اس کی بجائے کسی اور نے بالے پر پہلے ہی گولی چلا دی ہوتی۔

ماؤنٹ پیری کے اس دور دراز اور ویران مقام پر چند سیکنڈ تک گولیاں چلنے کی آواز سنائے میں دل دہلاتی رہی، لیکن یہ جان کر کہ مدِ مقابل بھی ضرور اچھا نشانہ باز ہے، بالے کو بار

بارچٹانوں اور سڑک کے کنارے کے سفید قلعی والے پتھروں کی آڑ لینی پڑتی۔مجبوری یہ تھی کہ اس کی موٹر سائیکل اس جگہ سے کافی دور جھاڑیوں میں پڑی ہوئی تھی اور وہ سایہ اپنی کار میں سوار ہو چکا تھا۔بہر حال وہ اسے نہ روک سکا۔سیاہ کار بڑی تیزی سے بیک لیتی ہوئی سڑک پر گھومی اور ڈھلوان کی طرف چل دی۔بالے کے پستول سے نکلی ہوئی آخری گولی نے اتنا کام ضرور کیا کہ اس کی ایک پچھلی کھڑکی کا شیشہ چور چور کر دیا اور شیشہ ٹوٹنے کی اسی آواز نے اس پر یہ انکشاف کیا کہ اس کی کھڑکیوں پر شیشے چڑھے ہوئے تھے، جو یقیناً اس قسم کے رہے ہونگے جن سے اندر کی چیز نظر نہ آ سکے۔

بالے بڑی تیزی سے اپنی موٹر سائیکل کی طرف بھاگا، لیکن جس وقت وہ اسے دھکیل کر جھاڑی کے باہر لایا تو یہ دیکھ کر اسے سر تھام لینا پڑا کہ اس کے پچھلے ٹائر کی ہوا نکل چکی تھی۔اس نے گھوم کر دیکھا، کیپٹن بوس اس وقت بھی اس چٹان کے پاس بیہوش پڑا ہوا تھا۔اس نے کمیونیکیٹر آن کر کے خان کو کال کرنا شروع کر دیا۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

دوا دارو خان

"بائیو، دوا دارو خان کا بروسہ جس نے نئیں کیا، اس نے اپنا ماں کا دودھ نئیں پیا، ڈبے کا دود پیا۔ خان بولتا خدا لگتی۔ کڑوی لگے تو آخ تھو کا مثال تھوک دو۔ میٹھا لگے تو حلوا کا موافق نگل جاؤ۔ بات سننے کا پیسہ نئیں۔ کوئی ڈرے غم خان جیسا نئیں۔"

"بایو، یہ کاہل کا خان، ذات کا پٹھان، قوم کا مسلمان، صاحبِ ایمان جس پر شک کرنے والا بے ایمان۔ تمارا واسطے قدرت کا بہترین تحفہ لایا ہے۔ تم دنیا کا سات عجائبات سنا، خان کے پاس آٹھ نو دس گیا رہ ہے۔"

"ام اس کو زمین کا سینے کے اندر گھس کر نکالا، دریا اور ندی نالا چھید ڈالا..."

"چھان ڈالا۔" پٹھان کے ساتھی دوسرے ادھیڑ عمر کے پٹھان نے آہستہ سے لقمہ دیا۔

"اوئے جونا خان ندی نالا گلاس کا پانی نئیں ہے جو تم چھان ڈالے گا۔ واللہ جھوٹ مت بولو۔" نوجوان پٹھان نے اسے ڈانٹ دیا۔ "پبلک کا منہ کالا کرتا ہے۔ تمارا بھی کالا ہو جائے گا۔" اس کے جواب پر جونا خان کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ شاید وہ کسی وجہ سے اس سے مرعوب تھا۔

جونا خان ادھیڑ عمر کا تندرست اور بھرے بھرے چہرے والا آدمی تھا۔ اس کے چہرے پر گھنی اور کھچڑی دار بالوں والی مونچھیں تھیں۔ کنپٹیوں کے بال پک گئے تھے۔ سر پر وہ پٹھانی صافہ باندھے ہوئے تھا۔ نوجوان پٹھان سرخ و سفید رنگ کا خوبصورت سا آدمی تھا۔ اس کی مونچھیں باریک اور تلوار نما تھیں۔ وہ سفید صافہ باندھے تھا، جس کے درمیان سے سنہری کلاہ کی چھت، جس پر باریک سنہری کامدانی کا کام تھا، جھانک رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کسی شریر

بچے جیسی قدرتی مسکراہٹ نمایاں رہتی۔اس کا نام دوا دارو خان تھا، جیسا کہ اس نے مجمع کو بتایا اور اس کے ساتھی کا جونا خان۔

چوڑی بلاس روڈ پر وہ فٹ پاتھ کے کنارے ایک بڑی سی سفید چادر پر کاٹل کے خشک میووں اور درجنوں اقسام کی پہاڑی جڑی بوٹیوں کے ڈھیر لگائے بیٹھے تھے۔راہ گیروں میں سے ایک آدمی نے اتفاق سے ان کے قریب رک کر ایک خشک خوبانی جیسے پھل کی تعریف پوچھ لی۔وہ بیچارا کوئی شریف آدمی تھا جس نے دوا دارو خان سے بہت آہستگی سے اس چیز کے بارے میں دریافت کیا تھا، لیکن جواب میں وہ خان کو دھاڑتے سن کر پیچھے ہٹ گیا۔خان حلق سے حملہ آوروں جیسی بلند آواز نکال کر بولا۔

''ام دوا دارو خان جنگل جنگل کا سندیافتہ قدرت کا بے شمار خزانہ اپنا جیب میں رکھتا ہے، برادر۔'' جواب سیدھا ضرور تھا، لیکن اتنی بلند آواز میں کہ دوسرے چلتے بھی اسے کوئی جھگڑا سمجھ کر ارد گرد جمع ہو گئے۔

''اوئے سبحان اللہ، خان کا بچہ، کیا مجمع لگایا ہے۔'' جونا خان نے اپنے ساتھی کی تعریف کی۔

''وڑا خوش حالا نہ تڑا ماشہ۔'' نوجوان نے اپنے ساتھی کو داہنی آنکھ سے گھور کر کہا۔

''کیا کہا، خان صاحب؟'' راہ گیر اسے اپنی بات کا مزید جواب سمجھ کر پوچھ بیٹھا۔

''ام اپنا ساتھی کو بولتا کہ مکھن مت مارو۔مکھن...مکھن تم سمجھتا؟ یعنی کہ مسکہ۔''

''اوئے خدا کا لعنت تم پر۔'' بڑبڑاتے ہوئے جونا خان نے منہ پھیر لیا۔

''ہاں تو، برادر، تم اس عجوبۂ قدرت کا احوال دریافت کرتا۔خان بتاتا تم کو۔اڑے لڑکا لوگ، یہ مداری کا تماشہ نہیں ہے، جاؤ جاؤ۔بڑا آدمی کا کام ہے۔بڑا آدمی کا...ہونہہ ...زمین سے اوگائیں دوا دارو خان کا بات سنتا ہے۔'' وہ مجمع میں جمع ہو جانے والے بچوں کو بھگاتے ہوئے بولا۔پھر اس نے چاروں طرف نگاہیں گھما کر دیکھا۔کافی لوگ جمع ہو چکے

تھے۔اس نے وہی خشک پھل ہاتھ میں اٹھالیا۔

''برادران، ہندو مسلمان، سکھ کرستان، یہ چھوٹا سا پھل جیسا آئٹم بم کے اندر پورا نیم کا دل ہوتا ہے۔''

''پورا نیم بول، بھائی۔''جونا خان نے پھر آہستہ سے اسے سمجھایا۔

''ام غلط کیسے بولے گا، جونا خان۔ام درمیان خبردار اخبار پورا نیم پڑھا ہے۔''وہ پلٹ کر اپنے ساتھی پر اپنی قابلیت کا سکہ جمانے لگا۔''ام حکمت کا کتاب میں بھی پڑھا ہے کہ نیم کا درخت بڑا فائدے کا چیز ہے۔''پھر وہ مجمع کی طرف پلٹا۔''برادران، نیم کا درخت بڑا زبردست علم الحکمت ہوتا ہے۔نیم کا پتی اکسیر۔نیم کا چھال با تاثیر۔نیم کا پھل انسان کا تقدیر۔''

''اے لو، یہ تو پانی جڑی بوٹیاں بیچتے بیچتے نیم کے درخت پر چڑھ گیا۔''مجمع سے کوئی بولا۔

''برادر خان جھوٹ سے نفرت کرتا۔کون صاحب بولا کہ ام درخت پر چڑھا ہے۔ امارے پاس امراض چشم کا اکسیر بوٹی بھی ہے۔اندھے کو کھلا دو تو آنکھوں والا ہو جائے۔کالے کو کھلاؤ تو وہ عشق لڑانے لگے۔آنکھ کا پھلی، کان کا جالا، کنٹھ مالا، سب صاف۔بولنے والے بائی کا آنکھ بھی صاف۔''

دوادارو خان کے اس مکالمے پر لوگ بے اختیار ہنس پڑے اور خان کا مذاق اڑانے والا کچھ جھینپ سا گیا۔

''خوچہ خان، دھندے کا بات کرو۔فالتو بات سے پیٹ کا دوزخ نئیں بھرے گا۔'' جونا خان نے نوجوان خان کو مشورہ دیا۔

''پیٹ اپنا کتا بھی بھرتا ہے، برادران۔ام کو دولت کا لالچ نئیں۔ام کو ہیرالڈ المیا بننے کا خواہش نئیں۔ام اپنا پیٹ افغانستان میں گھاس کھا کر...نئیں...یعنی گھاس بیچ کر بھی

بھر سکتا تھا۔خان ادھر آیا ہے خلقِ خدا کا خدمت کرنے، مایوس لوگوں کو زندگی کا خوش خبری دینے۔اما را پیر سیّد بابا شاہ، اللہ اس کو جنت میں بہت بڑا محل عطا فرمائے، ام کو خلقِ خدا کی خدمت کے لیے ایسا ایسا معلومات بخشا کہ دنیا عالم کا بھلا ہوا ور لوگ دعا دے۔اما را پیر صاحب ام کو بولا، بابا خان، اندوستان جاؤ۔اندوستان کا لوگ بڑا دکھی ہے، مغموم ہے۔اس کا بھلا کرو، تمہارا خدا بھلا کرے گا۔اس لیے، برادران، یہ خان اور جونا خان اتنا دور دراز کا سفر کر کے تمارا خدمت کرنے اندوستان آیا ہے۔تمارے لیے دنیا جہان کی دولت لایا ہے۔"

"وہ دولت کہاں ہے، بھائی؟" مجمع میں سے پھر کسی کی آواز سنائی دی۔

"وہ دولت یہ ہے۔" خان نے چادر پر لگے ہوئے جڑی بوٹیوں کے ڈھیروں کی طرف اشارہ کیا۔"کوہِ نور سے قیمتی، دنیا بھر کے ہیرے جواہرات سے انمول۔اللہ اس کو جنت عطا فرمائے۔آپ کا ایک شاعر نے کہا ہے کہ ایک تندرستی ہزار نعمت ہے۔برادران عزیز، تندرستی ہے تو جان ہے، جان ہے تو جہاں ہے اور جان ہے تو خان ہے۔نئیں تو کچھ نئیں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک دوسری بوٹی بھی اٹھالی۔

"بائیو۔" وہ پھر بولا۔

"مجمع ہو گیا، دوادارو خان۔اب دھندے کا بات کرو۔" جونا خان نے پیچھے سے اسے مشورہ دیا۔

"یہ دھندے کا نئیں تو کیا رشتے کا بات کرتا ہے۔" وہ اسے جواب دے کر پھر پبلک کی طرف مخاطب ہوا۔

"خوچہ یارانِ اندوستان، بلبلانِ خوش الحان، میرا قلب و جان۔یہ جتنا عجائب آپ کے سامنے پھیلا ہے، واللہ تاثیر میں اکثیر ہے۔"

"خان آپ کو یہ نئیں بولے گا کہ اس کو کھا کر آپ ہاتھی کا مثال موٹا ہو جائے گا، خان نئیں بولتا کہ اس کا استعمال آپ اونٹ کی مثال لمبا ہو جائے گا۔اس کو کھا کر آپ گاما پہلوان بھی

نئیں بن جائے گا۔اس کو کھا کر آپ شیر کے موافق بہادر بھی نئیں ہو جائے گا۔''

''تو پھر کیا گدھا بن جائے گا؟'' مجمع میں سے پھر کسی نے تنقید کی اور کچھ لوگ بے اختیار ہنس پڑے۔

''جیسا نیت، ویسا برکت۔خان خدا لگتی بولے گا، برادر۔تم اس کو کھائے گا تو پھر خان کے پاس دوڑتا آئے گا۔بتیس ۳۲ خوراک، ۱۶ دن کا۔روزانہ دو ۲ ٹیم، یعنی کہ اوقات فجر کو ادھر سورج نکلا ادھر ایک پڑیا نکلا آپ کے منہ میں۔ادھر آپ رات کو سونے کو لیٹا دوسرا پڑیا منہ میں۔اس کا فائدہ حیرت انگیز۔جواب نہیں۔جوڑ جوڑ کا درد، دو خوراک میں غائب۔بدن کا سستی، پتہ نہیں چلے گا۔آدمی کو باندھ دو تو رسی تڑا کر بھاگے گا۔آنکھ کا روشنی، موٹر کار کا سامنے کا بتی سے تیز ہو جائے گا۔دماغ جوان خربوز کے جیسا تر و تازہ، دل شیر کی طرح قوی، لیکن، برادر، ایک فائدہ اور بڑا بھاری ہوگا۔قلت اولاد، کثرت اولاد میں بدل جائے گا۔برادر، افغانستان کو یہ جڑی بوٹی اپنا مثال آپ ہے۔آپ پٹھان کو دیکھتا، کتنا طاقتو رہوتا، سبحان اللہ، جیسے فولاد۔امارا یہ دوا کشتۂ فولاد کا بھی والد صاحب ہے۔اور اس جواہرات کا قیمت معلوم؟ صرف ایک روپیہ، برادر، صرف ایک روپی آ۔''

''ایک روپیہ، جو آپ پان کھا کر تھوک دے گا۔'' پٹھان نے ہانک لگائی۔''ایک روپیہ جو آپ کا جیب سے کہیں گر پڑا تو آپ اس کا کچھ نئیں بگاڑ لے گا۔وہی ایک روپیہ، برادر، آپ کو تندرستی کی بیش بہا دولت بخشتا ہے۔صرف ایک روپے میں ۳۲ خوراک، ۱۶ دن کا دو ٹیم۔ جس کو ضرورت ہے، طلب کرو، نئیں تو خان بابا کے لیے بچھتائے گا۔''

لیکن طلب کرنے کے نام پر مجمع کھسکنا شروع ہو گیا۔دوا دار و خان نے برا سا منہ بنا لیا۔

''اوئے خانہ خراب، ادھر کھڑا ہو کر فلم دیکھتا تھا کیا۔'' وہ پبلک کو غصے میں گھورنے لگا۔

''ٹیرو، ٹیرو برادرانِ ہندی، ذرا ٹیرو۔ایک بار امارا بھی سنتے جاؤ۔'' جونا خان جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔''ام تم کو افغانستان کا ایک قصہ سناتا ہے۔تم اس کو سن کر لیلیٰ کو بول جائے گا۔ ذرا مرد مضبوط کا مثال دو منٹ اپنا قدموں کو تکلیف دو۔'' اکھڑتا مجمع دوبارہ پلٹ پڑا۔شاید وہ دواؤں سے زیادہ ان جڑی بوٹی والے پٹھانوں کی گفتگو میں دلچسپی لے رہے تھے۔

''ملک بادشاہ خلقتِ خدا۔افغانستان کا ایک پارچہ فروش۔بائی برادر ایک پارچہ جانتا...پارچہ...'' جونا خان انھیں سمجھانے لگا۔

''اِدر بھوت سمجھدار لوگ ہیں، جونا خان۔سب سمجھتا ہے۔وہ اپنے کو بھی الو کا پٹھا سمجھتا ہے۔'' دوادا روخان نے لقمہ دیا۔

''سمجھتا ہوگا تم کو۔'' آہستہ سے یہ کہہ کر جونا خان پھر مجمع کی طرف مخاطب ہوگیا۔

''آں...تو بائی برادر، افغانستان کا ایک پارچہ فروش یعنی کہ بزاز یعنی کپڑے کا بیوپاری۔'' وہ پھر سمجھانے لگا۔

''ہاں ہاں، آگے بکو۔'' مجمع میں سے کوئی بولا۔نوجوان خان منہ پھیر کر ہنس پڑا۔

''خان بکتا نہیں، فرماتا ہے۔بولنے والا اپنا بھیجہ برابر رکھے گا، ایسا امید ہے۔'' جونا خان کا موڈ بگڑ گیا۔مگر فوراً ہی وہ پھر اعتدال پر آ گیا۔

''امارا پاس دنیا جہان کا اکسیر اعظم ہے۔اس کا نام ہے کشتۂ لولو والمرجان۔''

''یہ کیا بلا ہے؟'' کسی نے پوچھا۔

''بلا نہیں، لاجواب دوا ہے، برادر۔بچہ کھائے جوان ہوجائے، جوان کھائے نوجوان ہوجائے۔بوڑھا چار چار شادیاں کرے۔''

''اور پانچویں تم کر لینا۔'' یہ آواز بھی مجمع میں سے آئی۔

''ام اخبار والا اشتہار بازیں ہے۔خان کا بات سچا ہوتا۔وہ سچائیں تو خان مُیں۔ امارا بروسہ کرو، برادر۔''

''مگر تم قصہ سنا رہے تھے؟'' ایک اور آواز آئی۔

''قصہ ایسا ہوا کہ ایک کپڑا فروش زندگی کا رحمت سے مرحوم ہو گیا۔''

''محروم بکو، جونا خان۔'' نوجوان خان نے فارسی میں لقمہ دیا۔ ''یعنی کہ قدرت نے اس کا اولاد پیدا کرنے والا مشین چھین لیا۔''

جونا خان نے اس کی بات پر توجہ کیے بغیر اپنا بیان جاری رکھا۔ مجمع اب دلچسپی سے اس قصے کو سن رہا تھا۔

''وہ بد نصیب بیچارہ غریب آوارہ، آپ لوگ راج کپور کو نہیں سمجھنا، تو وہ دن رات رونا، آنسو سے اپنا منہ دھوتا، ویسے اما را افغانستان میں منہ دھونے کا نل بھی ہوتا، فریاد کرتا۔ مگر وائے تقدیر کہ کوئی اس کا مدد نہ کر سکا۔ کئی سال گزر گیا کہ ایک بار اما را مرشد ادر سے گزرا۔ پارچہ فروش دوڑ کر اس کا ٹانگ لیا، یعنی کہ پیر پکڑ لیا۔ بولا، حضرت، اما را نامردی دور نہیں ہوا تو ام خود کشی کر لے گا۔ پٹھان کے لیے ایسا زندگی موت سے خراب ہے۔ مرشد کو رحم آ گیا۔ ایک بوٹی عطا فرمایا کہ لو برادر، اس کو بچے کا چسنی کا موافق منہ میں ڈال کر چوسو، اللہ فضل کرے گا۔''

''پھر؟''

''اللہ اپنا فضل کیا۔ اب اس پارچہ فروش کا دو درجن اولاد ہے۔''

''وئی سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ قربان اس نسخے کے۔'' نوجوان خان نے تائید انعرہ مارا۔

''جس صاحب کو ضرورت ہو وہ اما را مکان نمبر ۳۲ لارنس روڈ پر تشریف لائے۔ ام ابھی ایک مہینہ تک اُدر پڑے گا۔''

لیکن بات ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ مجمع میں پھیلی ہوئی چہ مگوئیوں کے درمیان سے ایک نوجوان آدمی بھیڑ کو چیرتا ہوا سامنے آ گیا۔ وہ صورت ولباس سے کوئی تعلیم یافتہ شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔

Akram Allahabadi

''کیا بات ہے، بابو صاحب؟'' جونا خان نے اس سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

''مبارک ہو، خان صاحب۔ تمہاری دی ہوئی دوا بالکل کامیاب رہی۔'' وہ آدمی گرمجوشی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے بولا۔

''اوئے، سبحان اللہ۔ کتنا اولاد ہوا؟'' جونا خان نے خوشی سے پھول کر پوچھا۔

''ارے، ابھی پندرہ دن تو دوا کھائی ہے میں نے۔'' نووارد نے حیرت سے کہا۔

''جونا خان، ام تمہارا مونچھا کھاڑ کر چور بازار میں بیچ دے گا۔'' نوجوان خان ساتھی پر بگڑ پڑا۔ ''بابو صاحب کا پندرہ دن میں کیا پندرہ اولاد ہو گا۔''

مجمع کے لوگ ان کی گفتگو سن کر ہنسنے لگے، لیکن نووارد سنجیدہ تھا۔ اس نے جیب سے ایک سو روپے کا نوٹ نکالا اور جونا خان کی طرف بڑھانے لگا۔

''بابو صاحب، دینے لینے کا معاملہ اُدر، امارے مکان پر۔ اور ام روپے والا طاقت کا دوا بیچتا ہے۔'' دوادار وخان نے اسے نوٹ دینے سے روک دیا۔

''مگر یہ تو انعام...'' نووارد نے کہنا چاہا۔

''امارا تمارا زبان پانچ سو کا تھا، کچھ تو خوفِ خدا کرو، برادر۔'' جونا خان نے سو کے نوٹ کو حقارت سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ نے تو کہا تھا کہ فائدہ ہونے پر جو ہو سکے، دے دینا۔''

''اچھا اچھا، تم امارا مکان پر آؤ، تم کو اور دوا دے گا۔ پتہ نمبر ۳۲، لارنس روڈ۔'' نوجوان نے اپنی نوٹ بک میں ان کا پتہ نوٹ کر لیا اور شکریہ ادا کرتا ہوا کھسک گیا۔ صورت و شکل اور لباس سے وہ کسی طرح کوئی عیار آدمی یا کوئی ایجنٹ معلوم نہ ہوتا تھا۔ اس کے جاتے ہی لوگ دوادار وخان کی پڑیوں پر ٹوٹ پڑے۔ بہت سوں نے پتہ نوٹ کر لیا اور کھڑے کھڑے سو سوا سو روپے کی پڑیاں بک گئیں۔ جب مجمع چھٹ گیا تو دونوں پٹھانوں نے تمام جڑی بوٹیاں سمیٹ کر ایک تھیلے میں بھر لیں اور چادر کندھے پر ڈال کر چلنے لگے۔

Akram Allahabadi

"یہ روپے کون سے فنڈ میں ڈالو گے؟" جونا خان نے دوا دار و خان سے پوچھا۔

"امارا مرضی میں۔" نوجوان خان نے اکڑ کر جواب دیا۔

"لو یہ اپنی تھیلی لا دو۔"

"پارٹنر شپ، پارٹنر۔ میرے کاندھے پر چادر ہے اور پھر تم جونیئر ہو۔"

"جونیئر گئے چولہے میں۔"

"تجھے بھی اس قابل۔"

"کان پکڑتا ہوں جواب کبھی بھی تمہارے ساتھ کام کروں۔"

"آرڈر، آرڈر۔ تمہارے فرشتے بھی کام کریں گے۔ ابھی کیا ہے، ابھی تو مجمع لگانے کے لیے جھاڑو بھی لگانی پڑے گی۔"

"میں پبلک کے سامنے بھانڈا پھوڑ دوں گا۔"

"آدھے جوتے تمہیں بھی پڑیں گے۔"

"آخر اس سب کا مطلب کیا ہے؟"

"اس بار مطلب بتانے کی تکلیف نہیں کی گئی ہے، بس آرڈر۔"

"عجیب بات ہے۔"

"اوے شرم کرو، جونا خان۔ گلہری کا دُم منہ پر لگا کر روئے گا تو جتنا لوگ کیا بولے گا۔"

"لاحول ولاقوۃ۔"

"اوے چپ کرو، جونا خان۔ پبلک دیکھتا ہے۔"

جونا خان منہ بنا کر چپ ہو رہا، لیکن اوپری لبوں کے اوپر لرزتے ہوئے اس کی بڑی بڑی مونچھوں کے بال گواہی دے رہے تھے کہ وہ کچھ بڑبڑا رہا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

نئی تحقیق

خان نے بریک لگا دیا۔ کار ایک جھٹکے سے زرد رنگ کی ایک سہ منزلہ عمارت کے دروازے پر رک گئی۔ اسٹیئرنگ پر بیٹھے بیٹھے اس نے جیب سے نوٹ بک نکال کر دیکھا۔ ایک صفحے پر تیرھویں نمبر شمار کے ساتھ لکھا تھا:

۱۳۔ ڈاکٹر رحمن۔ ایم بی بی ایس (ویژل ڈیسیز ایکسپرٹ)

دوسری منزل، پاشکر مینشن، تربنی روڈ۔

"آج ہی آج میں آپ تقریباً نصف درجن ڈاکٹروں سے مل چکے ہیں، آخر معاملہ کیا ہے؟" پاس والی نشست پر بیٹھے ہوئے سارجنٹ بالے نے نوٹ بک پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں۔"

"تو کیا آپ محض ان کی مزاج پرسی فرماتے پھر رہے ہیں؟"

"تم یہیں بیٹھو، میں آتا ہوں۔"

"آپ کتنے ہی ناراض کیوں نہ ہوں، اس بار میں بھی ساتھ چلوں گا۔"

"اچھا چلو، کمبخت۔" خان نے کار کی کھڑکیاں دروازے لاک کر دیے۔ "لیکن بیچ بیچ میں بولنا نہیں۔ بعض ڈاکٹر بڑے خر دماغ ہوتے ہیں۔"

"واہ، خر کا دماغ اور ڈاکٹری۔ ہو ہی نہیں سکتا۔ انھیں تو گھاس کھانا چاہیے۔"

"میں نے زبان بند رکھنے کو کہا ہے۔"

"یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا...؟"

"شٹ اپ۔"

"شٹ اپ ان کی محفل میں۔"

Akram Allahabadi

خان کچھ نہ بولا۔ وہ پاشکر مینشن میں داخل ہوکر دوسری منزل پر ایک فلیٹ کے سامنے رک گئے، جس کے دروازے پر پیتلی تختی لگی ہوئی تھی اور اس پر ڈاکٹر رحمٰن کے حروف کندہ تھے۔

بیل بٹن پریس کرتے ہی ڈاکٹر کا نوکر باہر نکل آیا۔ اس نے ایک نظر ان دونوں کو دیکھا پھر نرم لہجے میں بولا۔

''صاحب یہاں مریضوں کو نہیں دیکھتے۔''

''مریض ہو گے تم۔ صاحب سے بولو دو پولیس آفیسر زان سے ملنا چاہتے ہیں۔''

بالے نے خان کے ایماء کے بغیر اپنی طرف سے جواب دیا اور نوکر چپ چاپ اندر چلا گیا۔

''تم بڑے بیوقوف ہو۔'' خان نے بالے کو گھورا۔

''تو پھر اور کیا کرتا۔ وہ تو بغیر ٹکٹ واپس کیے دے رہا تھا۔''

''تشریف لایے۔'' نوکر نے دوبارہ باہر جھانک کر کہا۔

وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ پتلے مرزا پوری قالین کو روندتے ہوئے جب وہ اس کمرے سے گزر کر ایک دوسرے چوڑے کمرے میں داخل ہوئے تو ایک ادھیڑ عمر کا سرخ و سفید صحت مند آدمی ان کا منتظر تھا۔ وہ خندہ پیشانی سے مسکرایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''فرمایے۔'' اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''سپرنٹنڈنٹ خان آف کرمنل انویسٹی گیشن ڈپارٹمنٹ۔'' خان نے اپنا تعارف کرایا۔

''اوہ، بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔ بہت تعریفیں سن چکا ہوں، آج دیکھ بھی لیا۔'' ڈاکٹر مسکرایا۔ پھر وہ بالے کی طرف ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے تعارف طلب کر رہا ہو۔

''یہ میرے اسسٹنٹ ہیں، سارجنٹ بالے۔''

''یہ بھی خوب رہی۔ان کو بھی دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔''ان سے بالے نے ہاتھ ملایا۔

''جی، بندہ کس قابل ہے۔''بالے نے انکساری سے کام لیا۔

''جی ہاں، یہ کسی قابل نہیں۔''خان نے اس پر صواد کرتے ہوئے ڈاکٹر سے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں اب مطلب کی گفتگو پر آجانا چاہیے۔''

''اوہ،ہاں،شوق سے۔میں تو خود پوچھنے والا تھا۔''

''کیا کبھی کوئی ایسا مریض بھی آپ کے پاس آیا ہے جو کسی وجہ سے اپنی مردانہ حیثیت سے محروم ہو کر جنون کی حد تک پہنچا ہوا ہو۔''

''ایسا مریض...؟''ڈاکٹر ذہن پر زور دینے لگا۔''ہاں، کیوں نہیں۔اس قسم کے بعض مریض یا تو انتہائی بزدل اور بجھے ہوئے ہوتے ہیں یا انتہائی چڑچڑے اور عاجز۔''

''ان میں کوئی ایسی خاص شخصیت جس کا جنون کافی بڑھا ہوا ہو؟''

''دیکھیے، جہاں تک مجھے یاد ہے ایسا کوئی خاص مریض میرے پاس نہیں آیا، لیکن ...''وہ کہتے کہتے سوچ میں پڑ گیا۔

''ذرا ذہن پر زور دینے کی کوشش کیجیے، ہوسکتا ہے کہ آپ کی ذرا سی توجہ ہمارے کام آجائے۔''

''کیا کوئی خاص معاملہ ہے؟''ڈاکٹر نے پوچھا۔

''یہ میں سر دست نہ بتا سکوں گا، کیونکہ میں خود بھی کسی آخری نظریے تک نہیں پہنچا ہوں۔''

''شاید آپ کے کام آسکے یہ بات...بہت دنوں کا واقعہ ہے۔''ڈاکٹر سنبھل کر بیٹھ گیا۔''ذرا ٹھہریے، پہلے چائے پی لی جائے۔''

''جی نہیں،شکریہ۔اس وقت تو معاف ہی رکھیے۔''خان نے معذرت کی۔

''خیر، ہاں تو میں اس واقعے کا ذکر کر رہا تھا۔ میرا خیال ہے یہ پچھلے سال کی بات ہے جب ایک رات کو یہیں میرے فلیٹ پر ایک عجیب سا مریض مجھ سے ملنے آیا۔ وہ ضرور کوئی شاندار آدمی تھا، کیونکہ اس کی بڑی کار نیچے کھڑی دیکھی گئی تھی۔ مجھے جو چیز اس میں عجیب معلوم ہوئی، وہ اس کا رویہ تھا۔ وہ ایک سفید باریک کپڑے سے اپنا چہرہ چھپائے ہوئے تھا۔ اس کے سر پر اونچی دیواروں والی فیلٹ ہیٹ تھی اور بدن پر ہلکا سیاہ السٹر۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے مجھے اپنا نام بھی بتانے سے انکار کر دیا تھا۔ شاید وہ اپنی اس کمزوری کو ایک راز ہی رکھنا چاہتا ہو۔ اکثر شریف اور معزز قسم کے لوگ ایسی کمزوری کا اعتراف کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اس لیے یا تو وہ سرے سے کسی معالج کا علاج ہی نہیں کراتے اور اگر کسی کے سامنے آتے بھی ہیں تو مختلف طریقوں سے خود کو چھپا کر۔ بہرحال میں تو اس آدمی کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ وہ مجھے خاصے ڈیل ڈول کا تندرست آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آواز بھی کافی رعبیلی اور بڑے لوگوں جیسا لب ولہجہ تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ اگر میں کسی طرح اس کی یہ کمزوری دور کر دوں تو وہ مجھے بہت اچھا معاوضہ دے گا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی شرط تھی کہ کسی کو معلوم نہ ہو پائے۔ لیکن میں نے سرے سے ہی اس سے معذوری ظاہر کر دی۔ میں نے صرف اخلاقاً اس کا معائنہ کیا اور پھر علاج کے لیے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میرے پاس اس کی دوا نہیں، کسی اور کو دکھایے۔''

''کیا اس کا مرض لاعلاج تھا؟'' خان نے دریافت کیا۔

''تقریباً۔ حالانکہ یہ اس کی اپنی کمزور نہیں تھی۔ اس میں ضرور اس کی زندگی کے کسی ایسے حادثے کو دخل تھا جو اس کے تحت الشعور سے اس کی اس کمزوری پر چھایا ہوا تھا۔ مگر اس شخص کا نفسیاتی علاج بھی ناممکن تھا، کیونکہ وہ اس قدر چڑچڑا اور غصہ ور معلوم ہوتا تھا کہ اسے کوئی (suggestion) دینا بھی میں نے فضول سمجھا۔ ایسے لوگ ذہنی طور پر کوئی منفی مشورہ قبول نہیں کرتے، نہ کہ جب جسمانی طور پر بھی وہ اس کا شکار ہوں۔''

''کیا آپ نے اس کی زندگی کے اس نامعلوم حادثے کو معلوم کرنے کی کوشش کی؟''

''اس سے اگر اس قسم کی گفتگو کی جاتی تو وہ مشتعل ہوجاتا تھا۔میرا خیال ہے کوئی ایسا حادثہ یا تو اس کی یادداشت سے اتر چکا ہوگا یا دانستہ طور پر کوئی ایسی چیز خود اس کے علم میں نہیں ہے سوائے اس کے کہ اس کے شعورِ تحتی نے کسی خاص جذباتی واقعے کا منفی ردِعمل قبول کر کے اپنے پاس محفوظ کرلیا ہو اور فہم وادراک سے اس کا کوئی تعلق نہ رہا ہو۔''

''کیا ایسا ممکن ہے؟''

''جی ہاں۔ایسے اکثر واقعات ہوتے ہیں جنہیں ہم غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں اور پھر بول جاتے ہیں،لیکن ان کا ردِعمل ہمارے تحت الشعور میں جذب ہوجاتا ہے اور ناقابلِ فہم طور پر کبھی نہ کبھی ہمارے زندگی کے کسی پہلو پر اثر انداز ہوتا ہے۔''ڈاکٹر نے بتایا۔

''اس آدمی کے سلسلے میں ایسا کون سا امکانی واقعہ قرین قیاس ہوسکتا ہے؟''

''مجھے اس کی ہسٹری اسٹیڈی کرنے کا موقع نہیں ملا نہ ہی میرے پاس اتنا وقت تھا، لیکن بعض حالات میں ایسے اثرات تحت الشعور(subconscious) پر کسی طاقتور خارجی تاثر سے مرتب ہوتے ہیں۔مثلاً غیر محسوس طور پر کسی کے دل ودماغ پر شدید نفرت،شدید غصہ یا شدید غم کا کوئی فوری اور وقتی اثر گزر جائے یا کوئی ایسا خوف جس کی قوت مدافعت پر واہ نہ کرے،لیکن دماغ جسے لاشعوری طور قبول کرلے۔شاید آپ بھی جانتے ہونگے کہ دوسرے جانداروں کے برعکس جنسیات کے معاملے میں انسان کا دماغ اس کے جذبات کا حاکم ہوتا ہے۔یہ ایک کمزور سے کمزور شخص کو وقتی طور پر طاقتور اور طاقتور سے طاقتور آدمی کو وقتی طور پر کمزور بنا دیتا ہے۔شاید ایسا ہی معاملہ اس کے ساتھ رہا ہوگا۔ورنہ ایک تندرست اور تنومند آدمی کے اس طرح ناکارہ بن جانے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔''ڈاکٹر اپنا بیان ختم کر کے خان کی طرف دیکھنے لگا۔

Akram Allahabadi

''میں نے آپ کا کافی وقت خراب کیا۔''

''کوئی بات نہیں۔یہ تو میرا فرض تھا۔''

''تو آپ اس شخص کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں رکھتے؟''

''قطعی نہیں۔وہ تنہا ہی میرے پاس آیا تھا اور اسی طرح چلا گیا۔کھڑکی سے میرے نوکر نے اسے نیچے ایک لمبی شاندار کار میں بیٹھ کر جاتے دیکھا تھا، جسے وہ خود چلا رہا تھا۔''

''ممکن ہے کوئی ایسی خصوصیت بھی اس میں رہی ہو جو اس کے سراغ کا سبب بن سکے، لیکن آپ نے اس میں دلچسپی نہ لیتے ہوئے اس پر غور ہی نہ کیا ہو۔ایسی چیز پھر بھی یادداشت کے کسی خانے میں محفوظ تو ہو سکتی ہے۔''خان نے مسکرا کر کہا۔

''آپ مجھے نفسیات کا فلسفہ پڑھا رہے ہیں۔''ڈاکٹر ہنسا۔''خیر، میں ایک بار پھر اسے اپنے تصور میں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔''یہ کہہ کر ڈاکٹر نے دونوں آنکھیں بند کر لیں اور کچھ سوچنے لگا۔

''ڈاکٹر صاحب مراقبے میں چلے گئے۔''بالے آہستہ سے بولا۔لیکن خان نے جواب دینے کی بجائے اس کا پیر دبا دیا۔جس کا مطلب یہ تھا کہ خاموش رہو۔ایک منٹ بعد ڈاکٹر نے آنکھیں کھولیں۔چند سیکنڈ وہ خان کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھا رہا، پھر پہلو بدل کر بولا۔''وہ ایک پیر پر خفیف سا جھک کر چلتا تھا۔اسے باہر جاتے ہوئے میں نے ذرا سا لنگڑاتے دیکھا تھا۔مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اس طرح چلنے کی اس کی عادت ہی رہی ہو۔''

''جی ہاں۔بعض لوگ ایک پیر کو جھول دے کر چلتے ہیں۔ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کا ایک پیر بچپن سے ہی کچھ ترچھا پڑتا ہے۔''خان نے تائید کی۔

''اچھا، اب اجازت دیجیے۔''وہ اٹھنے لگا۔

''اب تو چائے پی کر ہی جایئے، وہ دیکھیے، نوکر لے بھی آیا۔''ڈاکٹر کمرے کے اندرونی دروازے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔نوکر ٹرے میں چائے لے کر داخل ہو رہا تھا۔

چائے وغیرہ پی کر ڈاکٹر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ باہر نکل آئے۔ خان کار کی طرف بڑھتے ہوئے بھی کسی گہری سوچ میں پڑا ہوا تھا اور بالے کسی بھوکے بکرے کی طرح چیونگ گم سے جگالی کر رہا تھا۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کی بار آپ کس لائن پر سراغ رسانی فرما رہے ہیں؟'' وہ بول پڑا۔

''یہ ناسمجھوں کے سمجھنے کی بات نہیں۔'' خان نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

''چلیے میں گدھا، بس۔ اب تو بتایئے کہ جھیل والی لاشوں اور اس نامردوں کے شرطیہ علاج والے سلسلے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ مارو گھٹنا، پھوٹے آنکھ۔''

''بعض اوقات اس سے بھی عجیب طریق کا راختیار کرنا پڑتا ہے۔''

''آپ کا راختیار کیجیے یا بس، بندہ تو ڈاکٹر اٹل رائے کی دکان کھولنے کا ارادہ رکھتا ہے۔''

''کیوں؟''

''اللہ چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔''

''جوتے یا کچھ اور؟''

''کچھ اور۔''

''یہ تیرھواں ڈاکٹر ہے جس نے مجھے اس قسم کا بیان دیا ہے۔'' خان گفتگو کا رخ بدل کر بڑبڑایا۔

''میری عقل پر تو چٹانیں پڑ گئی ہیں۔ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟''

''میں جب تک خود کسی فیصلہ کن نتیجے پر نہ پہنچ جاؤں، اپنے خیالات رزرو رکھوں گا۔''

''تم کہاں تک پہنچے؟''

''جہاں تک آپ کی کار پہنچ چکی ہے۔''

''میں اس کام کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔''

''پندرہ بیس روپے روز کا منافع ہو رہا ہے۔ آدھے بھائی حرام مونچھ کو دے دیتا ہوں۔''

''پھر گدھا پن۔''

''آپ کی دعا سے قوت باہ کے مریضوں کے تعداد روز افزوں ترقی پر ہے۔ بھائی جونا خان دوا کے علاوہ دعا بھی دینے لگے ہیں۔''

''نتیجہ کیا نکلا ابھی تک؟''

''صفر۔ ویسے آپ فرمائیں تو یہ دھندا بند کر دیا جائے؟''

''ابھی جاری رکھو اور پروپیگنڈہ اور تیز کر دو۔ وہ شخصیت ابھی تک نامعلوم ہے۔''

''لیکن کیا ضروری ہے کہ وہ سڑک چھاپ دوا فروشوں کی طرف رجوع کرے؟''

''دوسری کوششوں میں ناکام ہو کر آخری امید کے سہارے آدمی معمولی چیزوں کی طرف بھی متوجہ ہو جاتا ہے۔''

''بہتر ہے۔ خاکسار کچھ دن اور بھاڑ جھونک لے گا۔''

''تم نے کہا تھا ماؤنٹ بیری پر جب تمہاری موٹر سائیکل کا پچھلا ٹائر بیکار کر دیا گیا تھا، اس وقت کپتان بوس وہیں بیہوش پڑا ہوا تھا۔'' خان نے کچھ سوچتے ہوئے بالے سے پوچھا۔

''جی ہاں۔ کیوں؟''

''پھر وہ کون شخصیت ہو سکتی ہے جو بیک وقت دو کام کرے؟ میرا خیال ہے وہ ضرور دو آدمی رہے ہوں گے۔ ایک نے کیپٹن پر حملہ کر کے سیتا کا اٹھایا ہوگا اور دوسرے نے تمہاری

Akram Allahabadi

موٹر سائیکل بیکار کی ہوگی ۔اگر تم ذرا حاضر دماغی سے کام لیتے تو دوسرا آدمی تمہیں وہیں کہیں مل جاتا، کیونکہ تمہارے بیان کے مطابق وہ سیاہ سایہ کار میں سیتا کو لے کر اکیلا بھاگا تھا۔"

"بات تو ٹھیک ہے۔میں واقعی اس وقت سوچ نہیں سکا۔"

"یاد رکھو اس قسم کے واقعات میں ذرا سی غفلت جان کے لالے بھی ڈال سکتی ہے۔"

"یاد رکھونگا۔"

"اب تم جاؤ اور کوئی خاص بات ہو تو فوراً اطلاع دینا۔"

"تار سے؟"

"دفع ہو جاؤ۔"

"پیدل ہی؟" بالے نے روندھی شکل بنائی، لیکن خان کو رحم نہ آیا۔خان نے گاڑی روک دی اور بالے کو اترنا ہی پڑا۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

نیا مریض

''لالہ، نمبر ۳۲ لارنس روڈ کاں ہے؟''

ایک عمارت کے دروازے پر اپنی کار روکتے ہوئے ایک موٹے سے آدمی نے باہر کھڑے ہوئے دربان کو اشارے سے بلا کر پوچھا۔

''اوئے قربان...قربان۔آسمان کے نیچے کھڑا ہو کر آپ پوچھتا آسمان کدر ہے۔ اِدر ہے، وئی ادر ہے۔'' لالہ نے پاس والی بلڈنگ کی طرف اشارہ کیا۔

''اوہ، اچھا۔یہاں کوئی جڑی بوٹی والا خان لوگ رہتا ہے؟'' نووارد نے سوال کیا۔

''بے شک، بے شک۔کائے کو نئیں رہے گا۔اُدر اوپر پہلا مالا پر دوا دا روخان جونا خان ٹیرا ہے۔بڑا لاجواب دوا دیتا ہے۔مرض بھی صاف، مریض کا طبیعت بھی صاف۔جاؤ جاؤ، اللہ فضل کرے گا۔'' دربان نے دوسری عمارت کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی رہنمائی کی۔

''کوئی چار سو بیسے تو نئیں ہیں نا؟'' نووارد نے اس سے تصدیق چاہی۔

''اوئے صاحب بہادر، تم پٹھان لوگ کو چار سو بیس بولتا۔خدا کا مار تم پر۔پٹھان ایماندار پیدا ہوتا، ایماندار جیتا، ایماندار مرتا۔جاؤ اپنا کام کرو۔تم اس کا دوا کیا کھائے گا، ہونہہ۔'' یہ کہہ کر دربان بڑبڑاتا ہوا لوٹ گیا۔

موٹا آدمی چند سیکنڈ تک کھڑا سوچتا رہا، پھر وہ اس کی بتائی ہوئی بلڈنگ میں داخل ہو گیا۔

پہلی منزل پر ہی اسے ایک دروازے پر لکڑی کا ایک بورڈ ٹنگا نظر آ گیا، جس پر خان برادران، حکیم الحکمت افغانستان، لکھا تھا۔

Akram Allahabadi

ایک لمحہ توقف کے بعد اس نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا۔

''خوچہ کون ہے یہ بڑھئی کا بچہ؟'' اندر سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔ موٹا آدمی اس جواب پر چونک پڑا۔ فوراً بعد ہی دروازہ کھلا اور ادھیڑ عمر مونچھ دراز جونا خان نے باہر جھانکا۔ آنے والے کو دیکھ کر اس نے اپنی پلکیں جھپکائیں اور پھر اسے دیکھنے لگا۔

''برادر، ام سو روپیہ خرچ کر کے بجلی کا گھنٹی لگوایا اور تم کھٹ کھٹ فرماتا ہے۔ خیر جاؤ فراموش کیا، آگے بولو کس کو ملنا ہے؟''

''جڑی بوٹی والے پٹھان یہیں رہتے ہیں؟''

''اوئے سبحان اللہ۔ تم گاہک واقع ہوا ہے۔ خوش آمدید، خوش آمدید۔'' جونا خان کا لہجہ بدل گیا۔ ''ولے برادر، ایک منٹ ٹیرو، ام خان بابا کو خبر کردے۔'' یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔

یہ دو سادہ سے کمرے تھے جن میں سے ایک میں ایک لکڑی کی الماری پر بہت سی شیشیاں رکھی تھیں اور ایک پرانی سی میز پر کئی تھیلیاں، ایک کھرل اور کچھ خشک پتے۔ اس سے ملحق کمرہ معمولی طور پر آراستہ تھا۔ فرش پر ایک گدے پر سفید چادر اور دو گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ پاس ہی ایک حقہ بھی رکھا ہوا تھا۔ یہاں ایک تکیے سے ٹکا ہوا وہ ادا روخان بیٹھا تھا۔

''وہاٹ از دی میٹر، مسٹر جونا خان؟'' نوجوان خان نے اس سے پوچھا۔

''یہ کمبخت کہاں آن مرا؟''

''کون ہے؟''

''تمہارا لنگوٹیا دوست، بارہ بنکی کی توپ۔''

''کون؟ شوکت؟''

''ہم۔''

''کہاں؟''

''دروازے پر موجود ہے، کسی دوا وغیرہ کے چکر میں آیا ہے۔''

Akram Allahabadi

جواب میں نوجوان خان کا قہقہہ چھوٹ گیا۔

''بلالونا، مزا آئے گا۔''

''اوراسی مزے میں کوئی کام کا آدمی آئیکا تو؟''

''اسے کسی بہانے چلتا کردیں گے۔''

''بلاتا ہوں۔حالانکہ مجھے اس کی شکل سے نفرت ہے۔''جونا خان بڑبڑاتا ہوا باہر چلا گیا۔ایک منٹ بعد جب وہ لوٹا تو شوکت اس کے ساتھ تھا،لیکن وہ ان پٹھانوں کو نہ پہچان سکا۔

''خودش آمدید، برادر۔خوش آمدید۔بیٹو، بیٹو۔''نوجوان خان اسے گدے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''فرماؤ، کیاخدمت کرے ہم آپ کا۔''شوکت نے ایک بار نظریں گھما کر کمرے کا جائزہ لیا اور پھر پتلون کے پائنچے اوپر کھینچتے ہوئے گدے پر ایک کنارے بیٹھ گیا۔

''اچھوت کا مثال اُدر کیوں ڈھیر ہوتا ہے، برادر۔اما راسر آنکھوں پر بیٹو، اما را دل میں بیٹو۔تم اما را معزز مہمان۔وئی مہمان خدا کا برکت۔اوئے جونا خان۔''وہ شوکت کو آرام سے بیٹھنے کی ہدایت کرتے کرتے جونا خان کی طرف مخاطب ہوا۔''اوئے، شرم کرو، مہمان صاحب آکے بیٹا ہے، جونا خان۔کچھ چائے، کچھ شربت، کچھ خاطر مدارات۔''

''نہیں نہیں، خان صاحب۔تکلیف کی ضرورت نہیں۔اپن ویسے ہی ٹھیک ہیں۔''

''او تکلیف کیسا، برادر۔واللہ مہمان کا خدمت عین راحت۔مہمان کا قدم...خیر و برکت۔اما را تمارا محبت، تم اما را بائی، ام تمہارا بائی۔اوئے جونا خان، بار والے کو تین چائے بولو۔''

''نہیں نہیں، خان صاحب، بس شکریہ۔''

''خالی خالی شکریہ۔نہ کلیا نہ پیا...اچا۔''نوجوان پٹھان نے معصومیت سے کہا۔پھر

وہ چیخ کر بولا۔ ''اوئے جونا خان، بس شکریہ بولو، باقی آئندہ۔'' پھر وہ آگے کی طرف جھک کر شوکت سے مخاطب ہوگیا۔

''اچا تو بسم اللہ، برادر۔''

''تم...تمارا علاج ولاج تو سچا ہوتا ہے نا؟'' شوکت نے ادھر ادھر دیکھ کر رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

''تم پٹھان پر بروسہ نئیں کرتا، واللہ آدمی ہے یا چلغوزہ۔'' خان کو غصہ آگیا۔

''نئیں، یہ بات نئیں۔''

''تو پھر کیا پرائیوٹ بات ہے؟''

جواب میں شوکت نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''اچا، بولو۔''

''بات یہ ہے کہ...مگر یار، کسی سے بتانا نہیں۔''

''لاحول ولاقوۃ۔ کیسا گفتگو کرتا ہے آپ، پٹھان کا سینہ ہزار دس ہزار رازوں کا مقبرہ ہوتا ہے۔ بلاخوف کہو۔''

''میں ایک لونڈیا پر مرتا ہوں۔''

''تو مرو۔'' خان نے جلدی سے کہا۔

''بات تو پوری سنو پہلے۔''

''مرنے سے پہلے کا بات ہے کہ بعد کا بات ہے؟''

''اف فوہ..مرنے کا مطلب، محبت کرتا ہوں۔''

''ایسا..تو سیدا سیدا بولنا، بابا۔ عشق ہوگیا تم کو اس سے۔ کیا نام بولا..لونڈیا...؟''

''وہ بہت خوبصورت لڑکی ہے۔''

''اوگا اوگا، ام کو کیا؟ اما را افغانستان میں حور کا مثال عورت ہوتا۔''

Akram Allahabadi

''میں اپنی بات کر رہا ہوں، خان صاحب۔''

''اوئے واللہ، ام تو بھول ہی گیا تھا۔ اچا تو پھر؟''

''وہ مجھے داد نہیں دیتی۔''

''داد نہیں دیتا تو کھجلی لے لو۔''

''یہ کیا مذاق ہے؟'' شوکت جھنجلا گیا۔

''معاف کرنا، برادر۔ ام افغانستان کا لوگ ابھی پورا اندوستانی نہیں جانتا۔''

''میں کوئی ایسا نسخہ چاہتا ہوں کہ وہ بت رام ہو جائے۔'' شوکت نے اس نامعلوم لڑکی کا تصور کر کے شاعرانہ انداز میں کہا۔

''او خدائی خوار، ابھی عورت کا بات کرتا تھا اور ابھی بولتا رام کا بت ہو جائے۔ برادر، بھیجہ تو آل رائٹ ہے تمہارا؟''

''اُف ... کن خربھیجوں سے پالا پڑا ہے۔'' شوکت رومال سے پسینہ پونچھ کر بڑبڑایا۔

''خوچہ برادر، اب اپنا اصل مدعا بیان فرماؤ۔''

''میں چاہتا ہوں کسی طرح وہ میری طرف مائل ہو جائے۔''

''لعنت۔ اس پٹان پر لعنت جو دلالی کرے، اس پر سو بار لعنت۔ برادر، انسان کو طاقت بخشنے کا دواخانہ ہے، گنڈا تعویز کا چکر نہیں ہے۔''

''میں نے تو سنا تھا کہ تمہارے پاس ایسی دوائیں بھی ہیں جو کسی کو کھلا دی جائیں تو ...''

''تو وہ تمہارا اوپر لٹو ہو جائے۔'' خان مسکرایا۔

''ہاں ہاں۔'' شوکت نے جلدی سے کہا۔

''تم اتنا پیسہ خرچ کرے گا؟''

Akram Allahabadi

''کیوں نہیں۔''

''اچاتو نکالودوسوروپے۔''

''دوسو...یہ لو۔''شوکت نے جلدی سے نکال کر دے دیے۔

''اس کا نام؟''خان نے سرگوشی کے لہجے میں پوچھا۔

''کوثر۔''

''کوثر؟ سبحان اللہ۔آپ کوثر،شراب کوثر،سبحان اللہ۔عمر کیا ہوتا ہے اس کا؟''

''ہوگی بیس اکیس...''

''ماشاءاللہ،ماشاءاللہ۔امارا افغانستان میں عورت تیس سال میں جوان ہوتا ہے۔''

''جلدی کرو،میرے پاس وقت کم ہے۔''شوکت نے کلائی کی گھڑی دیکھ کر کہا۔

''تمارا اس کا ملاقات ہوتا؟''

''وہ مجھے سیدھے منہ بات نہیں کرتی۔''

''اللہ اس کا ٹیڑھا منہ سیدھا کرے گا۔ام تم کو ایک دوا دے گا،تم اس کو پانی میں یا کسی شے میں گھول کر پلا دے گا۔پھر اس کو جو بولے گا،چلے گا۔وہ کتیا کا موافق تمارا پیچھے دم ہلاتا پھرے گا۔''

''پلانا ہے؟''شوکت سوچنے لگا۔''اچھا...لاؤدو۔''

دوادا روخان نے ایک چھوٹے سے بکس میں سے ایک چھوٹی سی تھیلی نکالی پھر اس میں سے ایک ڈبیہ نکال کر ڈبیہ کے اندر رکھی ہوئی پڑیوں میں سے ایک پڑیا نکال کر شوکت کو دے دی۔

''تمارا کام ہوگیا تو پٹھان کے لیے دعائے خیر فرمانا۔''

شوکت نے پڑیا کو احتیاط سے جیب میں رکھ لیا اور چوروں جیسے انداز سے چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔اس کے جاتے ہی جونا خان آپہنچا۔

Akram Allahabadi

''کیا با قاعدہ بزنس کرنے کا ارادہ ہے؟'' اس نے چھوٹے خان سے پوچھا۔

''خیال تو برا نہیں، لیکن میں اس بھینسے کو ایک چھوٹا سا سبق دینا چاہتا ہوں۔ آج کل اس کے عشق کا بخار بہت زوروں پر ہے۔ کمبخت ہر خوبصورت لڑکی کے لیے آہیں بھرنے لگتا ہے۔''

''اب کیا پروگرام ہے؟''

''وہی، فٹ پاتھ پر تم جھاڑو لگاؤ گے اور میں مجمع۔''

''یہ سلسلہ کب تک چلے گا آخر؟''

''جب تک خان صاحب کی مرضی۔''

''اور جو لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ہم ان پڑیوں میں طاقت بخش دواؤں کی جگہ صرف سنگھاڑے کا آٹا تقسیم کر رہے ہیں تو؟''

''تو بحیثیت پارٹنر جو کچھ ملے ففٹی ففٹی۔''

''باز آیا اس پارٹنر شپ سے۔''

''کیا کہتے ہیں، میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو۔''

''اب تو اوکھلی میں سر دیا ہی ہے۔''

جونا خان بڑبڑاتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

تہلکہ

آج صبح سے سارے شہر میں کھلبلی مچی ہوئی تھی، کیونکہ جھیل ڈونگرا سے سپلائی ہونے والے پانی میں باریک باریک کیڑے پائے گئے تھے اور پانی بھی گندلا تھا۔ مغربی علاقے کے کچھ لوگ اس پانی کو پینے کے بعد ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے جو ہیضے سے ملتی جلتی تھی۔ اور اسی وجہ سے حالات اور تشویشناک ہو گئے۔ پولیس کے خلاف ہر جگہ چہ مگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ کیونکہ مسلح پولیس کی محافظت کے باوجود یہ لاشیں جھیل میں پہنچ رہی تھیں۔ اخبارات میں انفرادی طور پر اور شہریوں کی انجمنوں کے ذریعے پر زور مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ مجرموں کو تلاش کر کے بدترین سزائیں دی جائیں۔ جراثیم کش ادویات بھی ان جراثیم کو کنٹرول نہیں کر پا رہی تھیں، جو بہت تیزی سے اپنی نسلیں بڑھا رہے تھے اور محکمہ صحت اور واٹر ورکس کی یقین دہانیوں کے باوجود پبلک میں ایک ہیجان پھیلا ہوا تھا اور اسے کنٹرول کرنا اسی صورت میں ممکن تھا کہ وقتی طور پر ڈونگرا جھیل سے پانی کی رسد بند کر دی جائے، مگر اس کا مطلب یہ تھا کہ سارے شہر میں پانی کی قلت واقع ہو جائے۔

اسپتالوں میں دوپہر بعد ہی مریضوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ یہ لاشیں اسی وقت جھیل میں دیکھی جاتیں جب پھول کر ان کی کیفیت بگڑ چکی ہوتی اور تہ کا پانی انھیں اچھال دیتا۔

پوسٹروں اور اعلانات کے ذریعے عوام کو پرسکون رہنے کی ہدایت کی جا رہی تھی، مگر ہیجان قابو میں نہیں آتا تھا۔ محکمۂ صحت کی طرف سے دن میں کئی بار اعلان کیا جاتا تھا کہ پینے کا پانی ابال کر پیا جائے، لیکن اسی نصیحت پر عمل کرنے کے باوجود لوگوں کے ذہنوں میں جھیل میں پائی جانے والی سڑی ہوئی لاشوں کا تصور کچھ اس طرح جم گیا تھا کہ وہ ابلا ہوا پانی بھی بڑی

کراہت کے ساتھ اور مجبور ہو کر پیتے تھے۔ ہنگامی ضرورت کے مطابق پانی کو ڈبل فلٹر کیا جا رہا تھا، حالانکہ اس طرح اس کی حیاتیاتی قوت کافی حد تک گھٹ جاتی۔

بہر حال کچھ عجیب سی نا قابلِ فہم صورتِ حال تھی۔ روزانہ تین چار گھنٹے پانی کا بہاؤ روک کر جھیل کے مین پائپ لائنوں کے بڑے ۶ فٹ ڈائی میٹر کے پائپ صاف کرائے جا رہے تھے، لیکن قصور ان پائپوں کا بھی نہ تھا۔ جھیل کا پانی ہی گندا ہو چکا تھا اور ادویات اور قدرتی ہوا سے اس کے صاف ہونے کے لیے کم از کم ہفتہ دس روز کی مہلت درکار تھی۔ ایک دو دن کی بات ہوتی تو سپلائی کا سلسلہ منقطع کر کے بھی یہ کام کیا جا سکتا تھا۔ جھیل کے اطراف میں بھی کوئی ایسی عمارتیں یا چھوٹی موٹی بستیاں نہیں تھیں، جن سے اس امکان کی وجوہ ملتیں کہ ہو سکتا ہے یہ سلسلۂ جرائم شہر سے باہر چل رہا ہو، سوائے ماؤنٹ پیری کے۔

جھیل کی دوسری سمتیں اتنی کھلی ہوئی اور واضح تھیں کہ ان سے گزر کر جھیل تک آنے کے لیے کھلے بنجر میدانوں یا ان کھیتوں کو عبور کرنا پڑتا جو کئی کئی بیگھے کے ٹکڑوں پر پھیلے ہوئے تھے اور یہ راستے کسی بھی غیر قانونی حرکت کے لیے قابلِ استعمال نہ تھے، ویسے نگرانی ان پر بھی قائم تھی۔

خان خود کئی بار جھیل اور اس کے اطراف کا جائزہ لے چکا تھا، لیکن اس حقیقت نے ان وارداتوں کو اس لیے اور بھی پراسرار بنا دیا تھا کہ لاشیں کہاں سے آتی ہیں؟ کس طرح آتی ہیں؟ یہ قتل کیوں کیے جاتے ہیں؟ کون کرتا ہے؟ اب تک معلوم نہ ہو سکا تھا۔ حکامِ اعلیٰ پریس کی تنقیدوں اور شہریوں کے مطالبوں سے گھبرا اٹھے تھے۔ اس وقت بھی پولیس کمشنر کے آفس میں خاص خاص افسروں کی ایک کانفرنس جمی ہوئی تھی۔ ان میں سپرنٹنڈنٹ خان بھی موجود تھا، لیکن اس نے اپنی طرف سے ابھی تک کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ دوسرے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔

''میری رائے میں تو یہ لاشیں دور سے پانی میں پھینکی جاتی ہیں۔'' ایس پی سالومن

کہہ رہا تھا۔

''اس صورت میں ان کے گرنے کی آواز ہونی چاہیے جو ہمارے نگراں فورس کے آدمیوں کو چونکا سکتی ہے۔'' کمشنر نے خود اس کی تردید کر دی۔

''کیوں نہ اس جھیل کو بند کر دیا جائے۔'' ایک مضافاتی سپرنٹنڈنٹ نے مشورہ دیا۔

''یہ ایک احمقانہ تجویز ہے۔'' کمشنر نے منہ بگاڑ کر کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ ہم کچھ بھی نہ کر سکے۔''

''سب سے پہلے تو ہمیں کرائم کا موٹو دریافت کرنا چاہیے۔'' ڈی سی پی نے رائے دی۔

''آپ کا کیا خیال ہے، خان صاحب؟'' کمشنر نے سپرنٹنڈنٹ خان کی طرف گھوم کر پوچھا۔

''میں ان تمام کیسز اور ان کے ردِعمل کا جائزہ لے چکا ہوں۔ مقتولین کے عزیزوں اور واقف کاروں میں بھی اس قسم کا کوئی آدمی نہیں ملا جس پر شبہ کیا جا سکے۔ کوئی محبت، رقابت یا دولت جائیداد کے جھگڑے بھی نہیں پائے گئے۔ ان حقائق کے پیشِ نظر ان جرائم کا مطمع نظر ایک ہی ہو سکتا ہے۔''

''پاگل پن؟'' کمشنر بول اٹھا۔

''یا تفریح۔'' خان نے سنجیدگی سے ان کے چہروں پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

''ایک خاص قسم کے ذہنی مریض کی ایک خاص تفریح۔''

''جمپنگ ٹو کنکلوژنز۔'' سالومن نے جلے ہوئے انداز میں، اندازوں پر تیر مارنے کے انگریزی الفاظ ادا کیے۔ خان کے چہرے پر ایک تحقیر آمیز خفیف مسکراہٹ ابھری اور معدوم ہو گئی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ سالومن سپرنٹنڈنٹ کے عہدے تک کسی خاص محنت یا صلاحیت سے نہیں پہنچا ہے۔ اس کا یہ عہدہ اعلیٰ حکام کی خوشامد اور غلامانہ تابعداری کا مرہونِ

منت تھا۔

''اور اگر میں یہ کہوں گا کہ یہ لاشیں آسمان سے ٹپکتی ہیں تو آپ جمپنگ ٹونیوسنس قرار دیں گے۔''

خان کے اس جملے پر بعض افسر ہنس پڑے، لیکن کمشنر بدستور سنجیدہ رہا۔ وہ جانتا تھا کہ خان اصول کا سختی سے پابند ایک ذمے دار آفیسر ہے۔ وہ کوئی غیر ضروری یا بے معنی بات زبان سے نہیں نکالتا، نہ ہی اس نے کبھی اپنے سے بڑے افسروں سے بے تکلف ہونا پسند کیا ہے۔ وہ خان کی شکل دیکھنے لگا۔

''میرا خیال ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' کمشنر سنجیدگی سے بولا اور اس کے اس جملے نے پورے ماحول کو گہری سنجیدگی میں بدل دیا۔ سالومن کی یہ جرأت بھی نہ ہوئی کہ وہ خان سے نظریں ملا سکے۔

''لیکن اس کا علاج؟'' مضافاتی سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا۔

''میرا خیال مختلف ہے۔ مجھے شک ہے کہ کہیں یہ پلیگ کے کیڑوں کی چوری جیسا ہی کوئی کیس نہ ہو۔'' ڈی سی پی نے کچھ دیر سوچ کر کہا۔

''بے ادبی نہ ہو تو میں اس کی تردید کرونگا۔'' خان بول اٹھا اور پھر سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''طاعون کے کیڑوں کی چوری کے کیسز کے بعد سے ہی سرکاری طور پر اس بات کا انتظام کیا جا چکا ہے کہ ہر ہفتے سرکاری ماہرین دوا فروشوں کے اسٹاک اور ان کی کوالٹی چیک کریں۔ اب صرف رجسٹرڈ فرمیں ہی دوا فروشی کا بزنس کرتی ہیں اور ان کو باقاعدہ لائسنس دیے جاتے ہیں۔ وہ صرف ان ہی دواؤں کے اسٹاک رکھ سکتے ہیں جو سرکاری طور پر تسلیم شدہ اور تصدیق کردہ ہوں۔ میں نے اس ہفتے خود میڈیکل بورڈ کے سکریٹری سے کہہ کر خاص طور پر یہ چیکنگ کروائی ہے۔ کہیں بھی نقلی ادویہ نہیں پائی گئیں۔'' خان نے بتایا۔

Akram Allahabadi

''ہوسکتا ہے کہ سیل...''

''یہ بھی خیال غیر ضروری ہوگا، اس لیے کہ پہلے ہی دوا ساز فرم ضرورت کے مطابق مال فراہم نہیں کر پا رہی ہیں۔''

''تو پھر اور کیا بنیاد ہو سکتی ہے؟'' ڈی سی پی بڑبڑایا۔

''میں اپنی رائے کی تشریح ابھی نہ کر سکوں گا، لیکن جہاں تک ممکن ہو، بہت جلد حقائق آپ لوگوں کے سامنے آجائیں گے۔'' خان نے انھیں یقین دلایا۔

مزید بحث بیکار رہی تھی۔ وہ اس سے زیادہ اور کیا کر سکتے تھے جو کر رہے تھے۔ اس لیے میٹنگ برخاست ہوگئی۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

مرمّت

کیفے ونسمٹ میں، جسے بالے کی نظر سے بچنے کے لیے شوکت نے اب اپنی تفریح گاہ منتخب کیا تھا، ایک میز تن تنہا بیٹھا شوکت بیقراری سے کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ اس میں ۸ بج رہے تھے۔

''ابھی تک نہیں آئی سالی۔'' وہ زیرِلب بڑبڑایا۔ پھر وہ نظریں گھما کر کیفے کے وسیع ہال میں دوسری میزوں پر بیٹھے ہوئے ان جوڑوں یا ان لڑکیوں کو دیکھنے لگا جو آپس میں ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ اس نے ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس کھینچی اور پھر دروازے کی طرف رخ کر لیا۔

''آئی ___ آئی ___'' وہ آپ سے آپ ہی کرسی سے ذرا سا دوہرا اچھلا۔ دروازے سے آسمانی رنگ کے ریشمی غرارے اور آسمانی فراک میں ملبوس۔ سیفون کا زرد دوپٹہ لہراتی ہوئی ایک خوبصورت جوان لڑکی اندر داخل ہو رہی تھی۔ وہ کافی بے باک معلوم ہوتی تھی۔ سینے سے دوپٹے کا آنچل ڈھلکا ہوا تھا۔ شاید اس طرح کا مظاہرہ کرنا بھی فیشن کا ایک جزو ہو۔ وہ کیفے کی نشستوں پر کسی کو تلاش کر رہی تھی اور شوکت کسی یتیم بچے کی طرح اسکے چہرے کو کھوئی کھوئی نظروں سے تک رہا تھا۔ وہ پچھلے ایک ہفتے سے اس لڑکی کو اسی طرح بھوکی پیاسی نظروں سے گھورتا رہا تھا۔ اس نے اس کا نام اس لڑکی کی ایک سہیلی کے منہ سے سن لیا تھا جو اسے پکارتی ہوئی ایک دن قریب سے گزری تھی۔ ویسے اس لڑکی نے آج تک شوکت کو کوئی لفٹ نہیں دی تھی، بلکہ جب وہ اسے اپنی طرف کسی حوقل کی طرح گھورتے دیکھتی تو ایسا منہ بنا لیتی جیسے کسی مسجد کے موذن کی نظر صبح صبح کسی سور پر پڑ گئی ہو۔ اس کی اس بے التفاتی نے شوکت کے عشق کا ٹمپریچر اعتدال سے آگے گزار دیا تھا۔ وہ اس پر زبردستی عاشق ہوا تھا، کیونکہ اس نے اس کی پرواہ

تک نہ کی تھی۔

وہ یہاں ایک اپنے نوجوان دوست سے ملنے آیا کرتی تھی اور اس کے آنے کے تھوڑی دیر بعد وہ دونوں اٹھ کر کہیں باہر چلے جاتے تھے۔ مگر وہ اکہرے بدن کا سانولا سا لڑکا تھا۔ اس وجہ سے شوکت کو یہ غلط فہمی ہوئی تھی کہ وہ اس سے تو بدرجہا بہتر ہے۔ اگر وہ اس لڑکی کی طرف التفات کا اظہار کرے تو وہ یقیناً اس نانسینس کو چھوڑ کر اس جیسے تندرست جوان اور خوبصور آدمی کو اپنا تاجدارِ محبت تسلیم کرنا پسند کرے گی۔ اسے حماقت سمجھا جائے یا سمجھ اپنی اپنی کہ شوکت نے خود کو کبھی بھی کسی سے کم خوبصورت مرد تسلیم نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی ۲۶ سالہ عمر میں بھی اپنی سالگرہ کا حساب پانچ۔ دس سال کم کر کے ہی لگاتا تھا۔ اس لیے نوجوان بھی تھا۔

کوثر کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش میں آج بھی وہ طرح طرح کے چہرے بنانے لگا اور بعض وقت تو دیو داس جیسی شکل بناتے بناتے وہ وکٹوریہ گارڈن کا کوئی نیا جانور معلوم ہونے لگتا، لیکن اپنے تئیں وہ اسے بھی ایک پوز سمجھتا تھا۔

آج وہ دوادار وخان کی بخشی ہوئی اس طلسمی دوائے مل بوتے پر اکڑ کر بیٹھا تھا۔ کوثر کو دیکھ کر اس نے اپنا سینہ کچھ اور پھلا لیا اور کچھ اس انداز سے اس کی طرف گھورا جیسے سمجھ رہا ہو کہ وہ اب اس کے قدموں میں گرنے آ رہی ہے۔

کوثر نے پاس سے گزرتے ہوئے ایک بار شوکت کی طرف دیکھا اور پھر چہرے کو غضبناک بنا کر 'ہونہہ' کہتی ہوئی پاس سے گزر گئی۔

''ہائے رے تیری ہونہہ۔'' شوکت نے ٹھنڈی سانس کھینچی اور کرسی ذرا سی ترچھی کر کے اس کی طرف رخ کر کے بیٹھ گیا۔

''صاحب، کچھ منگتا؟'' بیرے نے ایک طرف سے آ کر اس سے سوال کیا۔

''اف...فوہ...کباب میں ہڈی۔'' شوکت بڑبڑایا۔

''صاب، ادھر کباب میں ہڈی نہیں ہوتا۔ اور کباب بھی خلاص ہو گیلا ہے اور کوئی

چیز؟"

"ابے جاؤنا، چڑی کے...لو۔" یہ کہہ کر شوکت نے اس کی ٹرے میں چوٹی رکھ دی۔

"اچھا صاب، ضرورت پڑے تو آواز دو، ہم حاجر ہوئینگا۔" بیرا یہ کہتا ہوا سلام کر کے چل دیا۔ اور شوکت ٹھنڈی سانس کھینچ کر جیب میں پڑی ہوئی اس پڑیا کو ٹٹولنے لگا۔ کوثر اپنی میز پر بیٹھ چکی تھی۔ اس نے اس وقت بیرے سے صرف ایک گلاس پانی منگوایا تھا۔ شاید وہ کسی چیز کا آرڈر دینے سے پہلے اپنے دوست کی منتظر تھی۔ حسنِ اتفاق سے وہی بیرا جسے شوکت نے چوٹی دی تھی، کوثر کے لیے پانی لے کر جانے لگا۔ شوکت کا دل اندر سے تیز تیز دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنے سامنے رکھے ہوئے پانی کے گلاس میں وہ دوا دار وخان کی دی ہوئی پڑیا گھول دی۔

"اے...ایش...ششش..." اس نے بہت آہستہ آہستہ بیرے کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا اور بیرا پانی کا گلاس پلیٹ میں لیے ادھر ہی آ پہنچا۔

"پانی بعد میں دینا، ادھر رکھ دو۔ ذرا مجھے کاؤنٹر سے پی پی ایپس کی گولی لا دو۔ بلغم سا ...سانس رک رہی ہے۔"

"پیپس کی گولی؟" بیرے نے تصدیق کے لیے گولی کا صحیح نام لیا۔

"ہاں ہاں، وہی۔"

"اچھا صاحب۔" یہ کہہ کر بیرے نے گلاس اور پلیٹ وہیں رکھ دیے اور تیز تیز قدم اٹھاتا کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ جب وہ پیپس (peps) کی گولی لے کر واپس لوٹا تو شوکت گلاس بدل چکا تھا۔ اس کے چہرے پر اب سکون کے آثار نمایاں تھے۔

"آہا، شاباش، یہ لو چوٹی اور۔" شوکت نے اسے چوٹی کا مزید انعام دیا اور وہ سلام کر کے گلاس اٹھا کر چل دیا۔

شوکت اس وقت تک اس گلاس پر نظریں جمائے رہا جب تک کہ کوثر اس کا سب پانی پی نہ گئی۔ اس نے یہ ضرور دیکھا کہ وہ پانی پی کر کچھ منہ بنا رہی تھی۔ شوکت گھبرا گیا کہ کہیں

بھانڈا نہ پھوٹ جائے، لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ کوثر نے نہ میرے کو بلایا نہ اس کی یہ کیفیت زیادہ دیر رہی۔

اندر ہی اندر شوکت کا دل خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔ وہ اس دوائے تسخیر کے ردِعمل کا بے چینی سے منتظر بھی تھا۔ اور جب تقریباً پانچ منٹ گزر گئے، تو اسے یقین ہو گیا کہ اب وہ پڑیا اپنا کام کر چکی ہوگی۔ وہ جولیس سیزر کی فاتحانہ انداز میں اپنی نشست سے اٹھا اور لاپرواہی سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا بے دھڑک کوثر کے سامنے والی نشست پر جا بیٹھا۔ کوثر نے اس کی اس حرکت کو پہلے تو تعجب کی نظر سے دیکھا، لیکن پھر پہلو بدل کر خاموش بیٹھ گئی۔ شوکت نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور مسکرا کر رخ پھیر لیا۔ پھر دیکھا پھر رخ پھیر لیا اور پھر وہ انگلیوں کے سروں سے میز پر بینڈ بجانے لگا۔

''آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟'' کوثر جھنجلا کر پوچھ ہی بیٹھی۔

''اللہ قسم بالکل سچ۔'' شوکت اس جملے کو سنتے ہی بے ساختہ بولا۔ ''واہ خان بھائی۔''

کوثر اب تک سوالیہ نظروں سے اس کے چہرے کو گھور رہی تھی۔

''تو سنو۔'' وہ ذرا آہستہ لہجے میں اس کی طرف مخاطب ہوا۔ ''تمہیں مجھ سے عشق ہو گیا ہے۔'' اس نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ کہا۔

''آپ سے...؟'' لڑکی نے اس جملے سے اس کے ذہنی بے مائیگی کا اندازہ لگاتے ہوئے اس کا مذاق اڑانا شروع کیا۔

''ہاں۔ کیوں؟ اور اب تم کتیا کی طرح میرے پیچھے دم ہلاتی پھرو گی۔'' وہ پٹھان کے جملے دہرانے لگا۔

''لیکن دُم تو میرے ہے ہی نہیں۔'' کوثر مسکرائی۔ اس مسکراہٹ میں تضحیک بھی تھی اور خوفناک پن بھی، لیکن شوکت جیسے پلیٹونما آدمی پر اس کا کیا اثر ہوتا۔

''ارے میں، وہ تو مثال ہے ایک۔ یعنی کہ اب تم میری محبت میں آہیں بھرو گی۔''

''ہائے۔'' کوثر نے واقعی سرد آہ بھری کر دکھادی۔

''ارے سچ؟'' شوکت پھر خوشی سے اچھلا۔ ''قربان خان کی دوا کے۔'' وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔

''اور کچھ؟''

''اور یہ کہ اور کوئی اُلو کا پٹھا تمہاری نظر میں نہیں جچے گا۔''

''کوئی الو کا پٹھا نظر میں نہیں جچے گا۔'' لڑکی نے سحر زدہ انداز میں دہرایا۔

''اب تم میرے ساتھ چلو۔ اپن کہیں ماؤنٹ میری پیر پہ چل کے رومانس کریں گے۔'' شوکت یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''تشریف لے چلیے۔'' کوثر نے اس کے دماغ کے اسکرو اور ڈھیلے کرنے کے لیے کہا۔

''جواب نہیں پٹھان کی دوا کا۔'' شوکت نے تیسر بار ان پٹھانوں کو نذرِ عقیدت پیش کی۔ اور پلٹ پلٹ کر کوثر کو دیکھتا ہوا آگے آگے چلتا رہا۔ وہ اپنے ہونٹوں پر ایک خوفناک قسم کی مسکراہٹ لیے اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ کیفے کے دروازے کے باہر اس وقت سناٹا تھا۔ اتفاق سے دربان بھی موجود نہیں تھا۔ شوکت باہر نکل کر رک گیا اور کوثر کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔

''اب تو تم پیار کروگی نا مجھ سے؟'' شوکت نے اسے قریب آتے دیکھ کر پوچھا۔

''کیوں نہیں۔ لیجیے یہ بسم اللہ۔''

اور پہلی سینڈل کے کھوپڑی پر پڑتے ہی شوکت بھونچکا سا رہ گیا۔ اسے سڑک گھومتی نظر آنے لگی۔

''ارے ارے، یہ کیا مذاق...''

''میں نے بھرے ہال میں آپ کی عزت افزائی کرنا مناسب نہیں سمجھا، اس لیے

تنہائی میں آپ سے محبت کر رہی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے مسلسل پانچ چھ جوتے اور رسید کر دیے اور شوکت کے ہوش و حواس بگڑ گئے۔

''آپ جیسے شریف بدمعاشوں کے ساتھ تو اس سے بھی بدتر سلوک ہونا چاہیے، مگر یہ پہلا سبق تو لیجیے۔''

''ارے اللہ قسم، میں بدمعاش ودماش نہیں، وہ تو وہ سالے چار سو بیس...ارے سنیے تو...یہ میں نہیں...نہیں نہیں اللہ قسم...وہ سالے دو پٹھان...''

لیکن کوثر اس کی سنے بغیر اپنے دل کی بھڑاس نکالتی رہی اور اتنی دیر میں دروازے پر کم از کم دس پندرہ آدمیوں کا مجمع لگ گیا۔ ان میں ایک آدمی ایسا بھی تھا جو شوکت کی اس کیفیت پر بے تحاشا ہنس رہا تھا، لیکن اس نے رومال منہ پر رکھ لیا تھا۔

''کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟'' یہ کہتے ہوئے لوگوں نے انھیں گھیر لیا۔

''اسی گدھے سے پوچھیے۔'' کوثر یہ کہتی ہوئی اپنا سینڈل پیر میں ڈال کر کیفے میں واپس لوٹ گئی۔

''کیوں بھائی، کچھ شرم و غیرت ہے کہ نہیں؟'' ایک آدمی نے شوکت کے کاندھے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''جانے دو، بھائی، جانے دو۔ بیچارہ نشے میں ہے۔ دھکا لگ گیا ہوگا۔'' دور سے ہنسنے والے نوجوان نے درمیان میں آکر لوگوں کو سمجھایا اور لوگ کچھ ٹھنڈے پڑ گئے۔

''کون نشے میں ہے۔ ارے وہ تو...'' لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہے، اس آدمی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ مجمع تو خیر منتشر ہو گیا، لیکن شوکت کا اب برا حال تھا۔ اس نے جھینپی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور اپنا سر سہلانے لگا۔

''کیوں بیٹے، مزا آیا، غمِ عشق کا کچھ۔'' اس آدمی نے شوکت کی پیٹھ تھپک کر پوچھا اور شوکت نے جب آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا تو اس طرح اچھل پڑا جیسے کسی بچھو نے ڈنک

مار دیا ہو۔

''ارے، بالے بھائی۔'' اس کے منہ سے نکلا۔ ''یار مر گئے۔''

''کیوں کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں، میں ان پٹھانوں کی چٹنی بنا کر رہونگا۔ کتنی بھد کروادی سالوں نے۔'' شوکت غصے میں آستینیں چڑھانے لگا۔ اپنی زبان میں وہ بے عزتی کو بھد ہی کہا کرتا تھا۔

''خیر خیر، وہ بعد کی بات ہے۔ اس وقت تو تم یہاں سے دفع ہو جاؤ اور جوتے پڑ جائیں گے۔'' بالے نے نصیحت کی۔

''جاتا ہوں۔'' شوکت نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ''مگر اللہ قسم بدلہ لوں گا اس سالی سے۔'' وہ دروازے کی طرف رخ کر کے ایک ہاتھ کا گھونسہ ہوا میں بلند کرتے ہوئے غیر حاضر کوڑ کو چیلنج کرنے لگا۔

بالے جب کیفے میں داخل ہوا تو وہ لڑکی اپنی نشست پر بیٹھ چکی تھی۔ کیفے کا منیجر بالے کو پہچانتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ خطرناک بلا بلاوجہ نہیں آئی۔ وہ بار بار اسے گھورنے لگا۔ بالے کو اس کی یہ حرکت اتنی بری لگتی کہ بعض اوقات تو وہ اس منیجر کو کسی کیس میں اچھی طرح رگڑ دینے کے منصوبے بنانے لگتا۔ لیکن اس وقت وہ خود بھی اچھے موڈ میں نہ تھا، وہ کسی نشست پر بیٹھنے کی بجائے سیدھا کاؤنٹر پر ہی چلا گیا۔ منیجر نے اسے دیکھا، مگر ایک دوسرے گاہک کی طرف متوجہ رہا۔

''کیوں بیٹے اخروٹ۔'' وہ منیجر سے بولا۔ ''تم تو مجھے اس طرح گھورتے ہو کہ جی چاہتا ہے تم سے رومانس کر بیٹھوں۔''

''سارجنٹ صاحب، یہ مہذب انسانوں کی جگہ ہے۔'' منیجر نے کسی قدر مہذب بن کر جواب دیا۔

''مجھے معلوم ہے تم کتنے مہذب ہو۔ وہ کوکین کا بیوپار پھر کیا تمہارا باپ کرتا ہے؟''

بالے نے جملے کا دوسرا ٹکڑا آگے کی طرف جھک کر آہستہ لہجے میں ادا کیا۔لیکن خدا جانے اس میں کیا تاثیر تھی کہ ایک لمحے کے لیے منیجر کا چہرہ فق ہوگیا۔مگر فوراً ہی اس نے اپنی اس کیفیت پر قابو پالیا۔

''کک...کو...کونسی کوقین؟''منیجر نے اٹک اٹک کر جملہ ادا کیا۔

'' بکواس بند کرو، یہ لڑکی کون ہے؟''بالے نے لڑکی کی طرف اشارہ کر کے اس سے پوچھا۔

''لل لڑلڑکی...لڑکی ہے۔''

''مجھ سے اڑوگے تو تمہارے ہوش اڑادونگا۔''

''نہیں، مگر میں کیا جانوں، ہے کسی اچھے گھر کی۔روز کسی سانولے سے رنگ کے آدمی کا انتظار کرتی ہے۔''

''اور کچھ نہیں جانتے؟''

''بائی گاڈ، نہیں۔''منیجر کے ہوش اب ٹھکانے آچکے تھے۔

'' کتنے دنوں سے یہ سلسلہ چل رہا ہے؟''

''پچھلے چار پانچ دنوں سے تو دیکھ رہا ہوں یہی۔اس سے پہلے وہ لڑکا یہاں نہیں آتا تھا۔''

''ہُم۔''بالے سوچ میں پڑ گیا۔

''لیجیے، وہ آ بھی گیا۔''منیجر نے دروازے سے داخل ہوتے ہوئے ایک سانولے رنگ کے اکہرے بدن کے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو یہی ہے۔''یہ کہہ کر بالے کاؤنٹر سے کھسک کر ایک کرسی پر آ بیٹھا۔

وہ نوجوان آدمی جب کوثر کے پاس والی نشست پر بیٹھ چکا تھا اور وہ دونوں آہستہ لہجے میں کوئی گفتگو کر رہے تھے۔پھر دو منٹ بعد ہی وہ لڑکا اٹھا اور باہر نکل گیا۔اس کے جانے

Akram Allahabadi

کے بعد ہی کوثر بھی اٹھ کر باہر نکل گئی۔ جب وہ قریب سے گزر رہی تھی تو بالے نے کچھ ایسی صورت بنائی تھی جیسے اس کا دھیان کسی اور ہی طرف ہو۔ اس کے جاتے ہی بالے بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بیرا لڑکی کے چلے جانے کے بعد بڑبڑا رہا تھا۔

''لیا نہ دیا، ایک گلاس پانی... ہونہہ۔ باپ کا ہوٹل سمجھ رکھا ہے۔''

''ہوٹل کے دروازے پر ہلکی روشن کا بلب تھا، لیکن باہر اندھیرا اندھیرا تھا، شاید بورڈ کی روشنی خراب ہو گئی تھی۔ دروازے سے نکلتے ہی بالے اندھیرے کی طرف دبک گیا۔ اس نے دیکھا وہ دونوں ایک ٹیکسی میں بیٹھ رہے تھے۔

اس لڑکی کا کیریکٹر بالے کی نظر میں پراسرار بن چکا تھا۔ خصوصاً روز اس لڑکے سے ملنا اور اس کے آتے ہی دونوں کا باہر چلے جانا۔ ویسے وہ اس کی خوبصورتی میں بھی صرف اس حد تک دلچسپی لے رہا تھا کہ آج اس وقت اسے فرصت سی تھی اور ایسے میں یہ لڑکی اگر اس سانولے رنگ کے لڑکے یا شوکت جیسے احمق کی بجائے اسے لفٹ دے دیتی تو چند گھنٹے ضرور خوش گوار گزرتے۔ کئی دنوں سے کسی نئی لڑکی سے اس کی دوستی نہیں ہوئی تھی۔ بہر حال اس وقت وہ ان دونوں کا پیچھا کر رہا تھا۔ اور اگر نہیں وصل تو لذت ہی سہی کہ بمصداق یہ بھی ایک تفریح تھی۔

سڑک سونی تھی اور وہ ٹیکسی کافی تیز دوڑ رہی تھی۔ بالے نے اس وقت خان کی کار پر قبضہ کر رکھا تھا جو کیفے کے باہر کچھ فاصلے پر اس نے اندھیرے میں کھڑی کر دی تھی۔ خان شام ہی سے غائب تھا، اس لیے وہ اس کی کار اٹھا لایا تھا۔

ٹیکسی آگے چل کر ایک چوڑی مضافاتی سڑک پر گھوم گئی۔ یہاں اور بھی بھیانک سناٹا تھا۔ اس ٹیکسی میں اس وقت سوائے ان دونوں اور ٹیکسی ڈرائیور کے کوئی چوتھی ہستی نہ تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور ایک تندرست سا اجڈ قسم کا آدمی تھا۔ اس نے اپنی سواریوں سے اب تک کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔ وہ جس طرف چلنے کی ہدایت کرتے جاتے، وہ اسی سمت گاڑی ڈرائیو کرتا جاتا تھا۔

''وہ آج تو ضرور ملیں گے نا؟''لڑکی نے اپنے ساتھی سے سرگوشی کے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں ہاں،ضرور،لیکن پھر مجھے نہ بھول جانا۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے،تمہاری وجہ سے ہی تو میں ان تک پہنچ سکی ہوں۔''

''صرف ان الفاظ سے تو میری ضرورت نہیں پوری ہوسکتی۔آج کل جیب خالی ہورہی ہے۔''

''اوہ،تو پہلے ہی کہہ دیا ہوتا،اس میں جھجکنے کی کیا بات تھی۔''یہ کہہ کرلڑکی نے اپنا بیگ کھولا اوراس میں سے کڑکڑاتے ہوئے کچھ نوٹ نکال کراندھیرے میں ہی اس کے حوالے کردیے۔

''چلو کچھ تو کام چل ہی جائے گا۔''یہ کہہ کراس نے نوٹ جیب میں رکھ لیے۔

''گھبراؤ نہیں،ابھی اور دونگی۔''

''مجھے امید ہے۔''

لیکن ان کی گفتگو کا سلسلہ ٹیکسی ڈرائیور کی بے موقع نغمہ سنجی نے توڑ دیا۔وہ بے ہنگم سی آواز میں گا رہا تھا۔

''چلی گھوڑی پیا ملن کو چلی...''شاید اس کی زبان میں گوری کو گھوڑی ہی کہتے ہوں۔

سانولے رنگ کے نوجوان آدمی نے اسے گاڑی داہنی طرف کی سڑک پر موڑ لینے کو کہا۔یہ وہ سڑک تھی جو لکشمن کالونی کی طرف جاتی تھی۔اس سڑک پر خاصی آبادی تھی۔نئی ساخت کے چھوٹے بڑے مکانات،دکانیں،لیکن اس وقت تو سڑک سونی ہی پڑی تھی۔صرف آوارہ کتے ہی تفریح کرتے نظر آتے تھے۔

آگے ایک چوراہا تھا جہاں سے ایک دوسری سڑک اس سڑک کو کراس کرتی ہوئی شمال سے جنوب کی طرف گزرتی تھی۔اندھیرے میں اس سڑک کے کنارے ایک سیاہ رنگ کی

کار کھڑی ہوئی تھی۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہمارا کوئی پیچھا کر رہا ہو۔'' نوجوان آدمی نے کوثر سے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

''کہیں ڈیڈی کو خبر نہ ہوگئی ہو۔'' وہ سسکی لے کر بولی۔

''اوہ، نہیں۔اب ڈرنے کی ضرورت نہیں۔لو، وہ کار سامنے کھڑی نظر آرہی ہے۔ وہ تمہارا ہی انتظار کر رہی ہے۔اس نے کہا تھا اسی جگہ سے تمہیں یہ کار اس کے پاس لے جائے گی۔''

''اکیلے؟'' لڑکی نے خوفزدہ سے لہجے میں کہا۔

''کیا تمہیں اس پر بھروسہ نہیں ہے؟''

''بھروسہ کیوں نہیں۔ان کے لیے تو میں اپنی جان بھی دے سکتی ہوں۔''

''تو ٹھہرو، میں جیسے ہی ڈرائیور کو گاڑی روکنے کے لیے کہوں، تم جلدی سے اتر کر اس کار میں داخل ہو جانا۔''

''مگر کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ یہ ان کی ہی کار ہے؟''

''کیا اس کا یہاں موجود ہونا اس کا ثبوت نہیں...اور پھر مجھے معلوم ہے۔''

''اچھا۔'' وہ جی کڑا کرتے ہوئے بولی۔

''ڈرائیور، بس یہیں اس کار کے پاس چند سیکنڈ کے لیے روک دو۔'' نوجوان آدمی نے ڈرائیور سے کہا۔

''پہلے میرے پیسے۔'' ڈرائیور نے بروقت مطالبہ کیا۔

''ہاں ہاں، یہ لو۔'' اس نے جیب سے دو دس دس کے نوٹ نکال کر اسے تھما دیے۔

''کم ہے۔'' ڈرائیور بولا۔

''اور بعد میں دونگا۔'' وہ پچھلی کھڑکی سے سڑک دور تک صاف دیکھتے ہوئے بولا۔

Akram Allahabadi

''خیر۔'' یہ کہہ کر ڈرائیور نے کلچ دبا کر جھٹکے سے بریک لگا دیا۔نوجوان آدمی نے ٹیکسی سے فوراً ہی اتر پڑنے میں کوثر کی مدد کی۔اور کوثر کو یہ دیکھ کر شاید اطمینان ہو گیا کہ اس کے اترتے ہی اس کالی کار کی پچھلی نشست کا دروازہ آپ سے آپ کھل گیا۔وہ اس میں بیٹھ گئی اور سیاہ رنگ کی کار اسٹارٹ ہو کر تیزی سے دوسری سڑک پر گھوم گئی۔

''تم سیدھے چلتے رہو، اس طرح جیسے ہم رکے ہی نہیں۔'' نوجوان آدمی نے ڈرائیور کو ہدایت کی اور ڈرائیور کوئی جواب دیے بغیر گاڑی آگے چلانے لگا۔

''اررر.... ادھر نہیں، سیدھے۔'' وہ آدمی اسے گاڑی کالی کار والے راستے پر موڑتے دیکھ کر چیخا۔

''اوہ، میں سمجھا اس کے پیچھے۔'' ڈرائیور ہنس کر بولا۔

''گاڑی ادھر چلے گی، جدھر میں کہوں گا۔'' نوجوان آدمی نے تحکمانہ لہجہ اختیار کیا اور اس کے ساتھ ہی ڈرائیور کو کسی دھاردار چیز کی تیز نوک اپنی گردن پر چبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اس تیزی سے اسٹیرنگ مارا کہ گاڑی کے جھٹکے کے ساتھ وہ نوجوان آدمی بھی ایک طرف لڑھک گیا۔دوسرے لمحے ڈرائیور کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کوئی وزنی سیاہ سی چیز اس کے سر پر پڑی اور وہ اٹھ بھی نہ سکا۔ٹیکسی ڈرائیور اب اطمینان سے آگے جانے والی سیاہ رنگ کی کار کا پیچھا کر رہا تھا۔وہ گاڑی اب اس سڑک پر دوڑ رہی تھی جو تین چار میل کا چکر لیتی ہوئی گھوم کر پھر شہری علاقے سے جا ملتی تھی۔ٹیکسی اس انداز سے اس کار کا پیچھا کر رہی تھی کہ کار والوں کو اس کا احساس نہ ہو پائے۔ڈرائیور نے ہیڈ لائٹس بجھا دی تھیں اور کالی کار کی ہیڈ لائٹس کی پھیلتی روشنی کے سہارے تعاقب جاری رکھا تھا۔وہ نوجوان آدمی اب تک بیہوش پڑا تھا، لیکن اتنی دیر میں پیچھے سے سارجنٹ بالے کی کار بھی اپنی رفتار بڑھاتی ہوئی آ پہنچی۔یہ بڑا نازک موقع تھا، اس لیے کہ بالے اس بات سے واقف نہ تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور خود کیا رول ادا کر رہا ہے۔ڈرائیور دو طرفہ الجھن میں پڑ گیا۔اگر وہ اسے بتانے

کے لیے ٹیکسی روکتا یا دھیمی کرتا یا کسی قسم کے مخصوص اشارے کرتا، تو آگے جانے والی کار میں موجود شخصیتوں کا چونک پڑنا یقینی تھا، اور اگر کچھ نہ کرتا تو... لیکن اسے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملا، کیونکہ بالے نے شبے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پہلے تو وارننگ ایئر فائر کیا اور پھر وہ ٹیکسی کے پچھلے ٹائروں پر فائرنگ کرنے لگا۔

''گدھا۔'' ڈرائیور بڑبڑایا۔ بالے کا نشانہ خطا نہیں گیا تھا۔ ڈرائیور کو ٹیکسی بریک لگا کر روکنی پڑی، ورنہ ٹائر برسٹ ہو جانے پر ایکسیڈنٹ ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا۔ فاتحانہ انداز میں سارجنٹ بالے پستول ہاتھ میں لیے اپنی گاڑی روک کر جب نیچے اترا تو اسے غیر متوقع ردِعمل کا سامنا کرنا پڑا۔ صرف ایک ہاتھ اس کی گردن پر پڑا اور وہ ایسا طاقتور کہ بالے سڑک پر آ رہا۔

''میرا تو جی چاہتا ہے کہ ہنٹروں سے تمہارا کھال ادھیڑ دوں۔'' ڈرائیور جو ٹیکسی سے باہر نکل چکا تھا، دانت پیس کر اس پر گرجا۔

''بائی گاڈ، مجھے کیا معلوم کہ آپ...''

''اس آدمی کی مشکیں باندھ کر جلدی سے اپنی کار میں ڈالو۔'' لہجہ خان کا تھا اور بالے کو اس وقت اپنی حماقت کی وجہ سے خان کے ہاتھوں ملے ہوئے اس غیر متوقع انعام پر ذرا سا بھی افسوس نہ ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ کبھی اتفاق سے ہی خان اس کی کسی بیوقوفی پر اس قدر غضبناک ہوتا ہے کہ اس پر ایک آدھ ہاتھ چھوڑ بیٹھے، مگر بعد میں وہ اس سے اس طرح چمکارتا ہے جیسے کوئی باپ اپنے لاڈلے بچے کو۔ اور پھر یہ سوچنے اور افسوس کرنے کا موقع بھی نہ تھا۔ بالے نے سنجیدگی سے اس کے حکم کی تعمیل کی اور خود بھی خان کے برابر والی سیٹ پر خان والی کار میں جسے وہ خود چلا کر لا رہا تھا بیٹھ گیا۔

''مگر وہ ٹیکسی؟''

''لعنت بھیجو اس پر۔'' خان نے جھنجلاہٹ کے ساتھ کہا۔

Akram Allahabadi

''لعنت، ہزار بار لعنت۔''

اس جملے پر خان ہنس پڑا۔ دراصل وہ خود بھی اس پر ہاتھ چھوڑ بیٹھنے کے بعد اسے چمکارنا چاہتا تھا، مگر بالے کی اس حرکت نے یہ مسئلہ از خود حل کر دیا۔

''اب وہ شاید ہی ہمارے ہاتھ آئے۔''

''لیکن وہ لڑکی تو اس ٹیکسی میں ہی تھی۔''

''تم نے اگر جلدی سے اسے آملایا ہوتا تو شاید انھیں اس کا موقع نہ ملتا۔ وہ لڑکی ایک دوسری کار میں منتقل کر دی گئی ہے۔'' خان یہ کہہ کر خاموش ہو گیا اور بالے شاید اپنی اس شاندار حماقت پر جو اس سے نادانستگی میں سرزد ہوئی تھی، دل ہی دل میں افسوس کرنے لگا۔

ہوا وہی جس کا امکان پیدا ہو چکا تھا۔ وہ کار انھیں لاکھ کوشش کے باوجود نہ ملی۔ ۹ بجے شب کے بعد ٹریفک پولیس کا عملہ بھی ڈیوٹی چھوڑ دیتا تھا، اس لیے وہ کہاں گئی، کدھر سے گئی، اس کا بھی کوئی سراغ نہ مل سکا۔ ان کے پلے جو کچھ پڑا وہ صرف وہی نوجوان قیدی تھا، جس پر رات گئے تک تھرڈ ڈگری استعمال کے باوجود وہ صرف اتنا معلوم کر سکے کہ یہ شرمناک حرکت ہی اس کا بزنس ہے۔ وہ سوسائٹی گرلز اور رومان پسند لڑکیوں کا دلال تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اس آدمی کا نام، پتہ کچھ نہیں جانتا تھا جس کے سپرد کوثر کی گئی۔ وہ آدمی اسے گرین بار میں ملا تھا اور اس نے اسے اپنی تصویر دے کر ہدایت کی تھی کہ اس لڑکی سے مل کر اسے بتایا جائے کہ میں بیقراری سے اس سے ملنے کا منتظر ہوں۔ چنانچہ جب اس نے اس کی تصویر کوثر کو دی تو کوثر نے نہ صرف اسی تصویر کو اپنے پاس رکھ لیا، بلکہ چھپ کر اس سے ملاقات کرنے پر بھی آمادگی ظاہر کی۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک بار پہلے بھی گرین بار میں مل چکے ہیں اور وہ خود اس سے دوبارہ ملنے کو بے چین ہے۔ کوثر کے ملنے کا پتہ اور حلیہ اس نے اس دلال کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ کوثر سے ملنے کے بعد دلال روز گرین بار میں اسے ڈھونڈنے جاتا رہا، لیکن دوبارہ وہ اسے وہاں نہیں ملا۔ وہ اس طرح روز کوثر سے کیفے میں ملاقات کرتا اور اپنی ناکامی کا حال سنا دیتا۔ جس پر

کل کوثر نے اسے یہ لالچ بھی دی تھی کہ اگر کل یعنی واقعہ والے دن اگر اس نے اس کا پتہ نکال کر اسے اس سے ملا دیا تو وہ اسے انعام بھی دے گی ۔اور یہ اتفاق تھا یا قصداً کہ وہ پراسرار شخصیت اس ایجنٹ کو آج صبح ہی وینٹی برج کی تفریح گاہ پر ایک کار میں مل گئی۔اس نے اسے رات کو اسی مقام پر کوثر کو لے کر آنے کو کہا، جہاں وہ سیاہ رنگ کی کار کھڑی نظر آئی تھی اور کوثر کو ٹیکسی سے اس میں منتقل کیا گیا تھا۔ایجنٹ نے یہ بھی بتایا کہ وہ آدمی جس کار میں اسے ملا تھا،اس کا رنگ مٹیالا سا تھا۔کار کا نمبر اس نے دیکھا نہیں۔اس نے اس کا حلیہ بتاتے ہوئے کہا کہ وہ خاصے ڈیل ڈول کا خوبصورت تیس پینتیس سال کا آدمی معلوم ہوتا تھا،لیکن چہرے کے جو نقوش اس نے بیان کیے وہ انجانے سے تھے۔ایجنٹ نے اپنا نام پیٹمیر بتایا تھا۔

لیکن ایک خاص بات جو صرف خان کے لیے ہی اہم ہو سکتی تھی وہ اس نے قطعی غیر اہم سمجھتے ہوئے سرسری طور پر بتائی کہ وہ دوران گفتگو کسی نہ کسی چیز پر اپنے سیدھے ہاتھ کی دو انگلیاں بجانے کا عادی تھا۔انگوٹھے کے پاس والی انگلی اور درمیان کی بڑی انگلی۔وہ ان انگلیوں کے سروں کو اس طرح یکے بعد دیگرے ٹیکتا تھا جیسے بینڈ بجا رہا ہو۔اور ایسا کرتے وقت وہ گفتگو میں کھویا ہوتا یا عالم بے خیالی میں۔

اس کا بیان ریکارڈ کر لینے کے بعد خان نے اسے لاک اپ میں بھجوا دیا اور باقی رات انھیں بے چینی سے کوثر کی گمشدگی کے نتیجے کے انتظار میں گزارنی پڑی۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

خوبرو درندہ

لمبی سیاہ رنگ کی کار دوڑتے دوڑتے شہر سے ایک میل کے فاصلے پر ہی اس مضافاتی سڑک میں پھوٹنے والے ایک تنگ راستے پر گھوم گئی۔ یہ راستہ کچا تھا، اس لیے اس پر یا تو بیل گاڑیاں چل سکتی تھیں یا صرف آدمی۔ اس پر کسی کار کے ڈرائیو کیے جانے کا خیال غیر متوقع ہوتا، لیکن وہ کالے رنگ کی کار اس پر آسانی سے چلتی رہی۔ وہ جب کسی گڑھے میں ہچکولے لیتی، کوثر اپنی سیٹ سے اچھل کر اس براؤن کلر کے سوٹ والے خوبصورت آدمی پر آ گرتی جو کار کو ڈرائیو کر رہا تھا اور وہ مسکرا دیتا۔ وہ اس کی شخصیت، اس کے مردانہ حسن سے بری طرح متاثر تھی۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت اس کے بھڑکے ہوئے جذبات مچل رہے تھے۔ وہ اسے ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے اس کی شخصیت میں سما جانا چاہتی ہو۔

غالباً یہ راستہ یا تو اس بڑی مضافاتی سڑک کا شارٹ کٹ تھا یا علیحدہ ہی سے ایک اور۔ بہرحال جب کچا راستہ ختم ہوا تو ان کی کار مضافاتی ہائی وے پر آ گئی۔ اب وہ کالونی کے عقب سے ہو کر ایک چھتری ہوئی مضافاتی آبادی کے درمیان سے گزر رہے تھے، جہاں ہر طرف سناٹے اور اندھیرے کا راج تھا۔ اس آبادی کے بعد بڑی سڑک سے ایک چھوٹی شاخ پھوٹ گئی تھی جو تقریباً دو فرلانگ جنوب کی طرف چل کر ایک بیلوں سے ڈھکی ہوئی چار دیواری کے دروازے میں داخل ہو گئی تھی۔ اس دروازے پر باہر پتھر کے ایک چوکور ٹکڑے پر باغِ نشاط کے الفاظ کھدے ہوئے تھے۔ اندر ایک چھوٹا سا خوبصورت باغ تھا جو بہت صاف اور ڈھنگ سے تراشا گیا تھا اور درمیان میں قدیم و جدید طرز کے امتزاج کی تصویر بنی ایک یک منزلہ کوٹھی کھڑی تھی جس کی چھت کی دیواریں اونچی اور برج نما تھیں۔ عمارت میں شاید کوئی ذی روح نہ تھا، کیونکہ اندر اور باہر ایک ڈراؤنا سا سکوت طاری تھا اور اندھیری رات کی ویرانی نے اس کے

بھیانک پن کو اور بڑھا دیا تھا۔ دروازہ بند تھا اس لیے اس آدمی کو کار روکنی پڑی۔ اس نے کار کو گھما کر ترچھا کیا اور اسے اس طرح کھڑا کیا کہ اس کی ہیڈ لائٹس کا رخ اس ویران کوٹھی کے ایک اوپری کمرے کی کھڑکی کی طرف ہو گیا۔ اس کھڑکی میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ اس آدمی نے اس کھڑکی کو ہیڈ لائٹس کے زد میں رکھ کر ہیڈ لائٹس کو تین بار جلا کر بجھایا۔ اور چوتھی بار کوثر یہ دیکھ کر چونک پڑی کہ اس کھڑکی والے اندھیرے کمرے میں بتی جل گئی، جس کے ساتھ ہی ایک انسانی سایہ کھڑکی کھول کر باہر جھانکتا نظر آیا۔ کار پر نظر پڑتے ہی وہ تیزی سے کھڑکی سے غائب ہو گیا۔

بمشکل ایک منٹ بھی نہ گزرا ہوگا کہ سنسان اندھیری کوٹھی کسی کے قدموں کی چاپ سے گونج اٹھی۔ ہاتھ میں ٹارچ لیے ایک چھوٹے سے سر کا بھاری بھرکم آدمی جس نے ایک لمبا اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔ دو پیروں پر چلنے والے مداری کے ریچھ جیسی چال سے چلتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔ دور سے تو وہ کوئی گوریلا ہی معلوم ہوتا، لیکن قریب آنے پر معلوم ہوا کہ وہ چھوٹے سے سر اور چھوٹے سے چہرے والا ایک کافی طاقتور آدمی ہے، کیونکہ اس کا جسم پہلوانوں جیسا اور گٹھا ہوا تھا۔ اس کی پیشانی تنگ اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ اس کا سر گھٹا ہوا تھا۔ پیروں میں وہ بھاری بوٹ پہنے ہوئے تھا اور اپنی اس شاندار صحت کے باوجود وہ کاندھے جھکا کر چلنے کا عادی تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پانچ سیل کی لمبی ٹارچ تھی جسے وہ اندھیرے میں راستہ دیکھنے کے لیے استعمال کر رہا تھا، کیونکہ ایسی ویران جگہ پر حشرات الارض کی مہلک اقسام کے پائے جانے کا بھی امکان تھا۔ وہ سامنے آ کر وہ نووارد کو دیکھتے ہی ادب سے جھک گیا۔ وہ خوبصورت نووارد اب کوثر کو ہاتھ کا سہارا دے کر کار سے اتار رہا تھا۔

"تم اس کے ساتھ جاؤ، یہ تمہیں میرے کمرے تک پہنچا دے گا۔" اس نے نرم و شیریں لہجے میں کوثر سے کہا۔ لیکن کوثر اس چھوٹے سر کے آدمی سے کچھ خوفزدہ نظر آ رہی تھی، وہ جھجکنے لگی۔

Akram Allahabadi

''ڈرو نہیں، اس میں اور ایک وفادار کتے میں کوئی فرق نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے چھوٹے سر کے آدمی سے اشارے سے کچھ کہا، جس کے جواب میں وہ صرف اظہارِ اطاعت کے طور پر سر ہلا کر رہ گیا۔ پھر وہ نارچ چمکاتا ہوا آگے آگے ہولیا اور کوثر پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

اس کوٹھی میں پورٹیکو نہیں تھا، صرف ایک کافی چوڑا دالان نما حصہ سامنے تھا جس کی چھت اونچے اونچے ستوں پر قائم تھی۔ اندر مختلف کمروں کے اونچے اونچے محرابی دروازے تھے اور دائیں طرف اوپر جانے کا زینہ تھا جس کے ساتھ ساتھ لکڑی کی روک لگی ہوئی تھی۔ وہ چھوٹے سر کا آدمی درمیان کے بڑے دروازے پر ایک سیکنڈ کے لیے رکا، اس نے پلٹ کر کوثر کی طرف دیکھا اور اس وقت پہلی بار کوثر اس کی باریک مگر خوفناک آنکھوں کی خوفناک چمک دیکھ کر لرز اٹھی۔ چھوٹے سر کے آدمی نے پھر منہ پھیر لیا اور دروازے کو ڈھکیل کر کھول ڈالا۔ یہ اندر سے ایک شاندار ڈرائنگ روم تھا جو روشنی ہوتے ہی جگمگا اٹھا، لیکن وہ وہاں ٹھہرے نہیں۔

اس کمرے سے گزرنے کے بعد وہ ایک چھوٹے سے کاریڈور سے ہو کر ایک چوڑے دروازے والے دوسرے کمرے پر اتر گئے۔ اس کے باہر دبیز پردے لٹک رہے تھے۔ چھوٹے قد کے آدمی نے اسے بھی کھول دیا۔ اور اندر کی برقی بتیاں روشن کر دیں۔ یہ کمرہ پہلے سے زیادہ آراستہ تھا۔ فرش پر ایرانی قالین اور اس پر ایک اچھے قسم کا صوفہ سیٹ داہنی طرف کارنر سیٹ تھا، جس کے نزدیک ہی سیاہ شیشے کے ٹاپ والی ایک میز تھی۔ سیٹ کے بائیں سمت ایک شیشوں کے فریم والی الماری تھی جس میں برانڈی اور مختلف اقسام کی وہسکی کی بوتلیں بھری ہوئی تھیں۔ نیچے کے خانے میں شیشے کے گلاس وغیرہ تھے۔

کمرے میں داخل ہو کر چھوٹے سر کے آدمی نے کوثر کو صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر سر جھکا کر اظہارِ ادب کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔ کوثر حیران حیران سی اس پرحول سُونے مقام کا جائزہ لینے لگی۔ یہاں اس قدر آراستگی کے باوجود ایک بھیانک قسم کی ویرانی برس رہی تھی۔ ایک سوہانِ روح سناٹا، جیسے وہ کسی فرعون کا سجا سجایا مقبرہ ہو۔ وہ سمجھ نہ سکی کہ اس مقام پر اسے

اس قدر خوف کیوں محسوس ہو رہا ہے یا ممکن ہے احساس تنہائی کی وجہ سے۔ باہر کالی رات کے سائے سنسناتی ہوئی ہوا کی سیٹیوں پر بڑی بد روحوں کی طرف جھوم جھوم کر ناچ رہے تھے۔ وہ چڑیل بیل اور املی کے درخت تھے جو الف لیلیٰ کی کسی دیو کی طرح اپنے سر اٹھائے باغِ نشاط کی فصیل کے اس پار سے اندر جھانک رہے تھے۔

کھلتے ہوئے دروازے کی چرچراہٹ نے کوثر کا دل لرزا دیا۔ خدا جانے کیوں اس پر ایک عجیب سی دہشت مسلط ہوتی جا رہی تھی لیکن اندر داخل ہونے والا اس کا محبوب اجنبی تھا، جو اس ویران کوٹھی کا مالک ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس کا چہرہ اس وقت سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں ایک ہوسناک چمک تھی۔ کوثر اسے دیکھ کر سارا خوف بھول گئی۔ وہ کسی ناگن کی طرح بل کھا کر اٹھی اور دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ شاید خوف سے یا شدتِ جذبات سے۔

دھیرے دھیرے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے اس آدمی کی آنکھیں ابلی پڑ رہی ہوں۔ کوثر نے اپنی نیم وا آنکھوں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، لیکن نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں اسے خونخوار سی نظر آنے لگی۔ وہ سہم سی گئی... اور پھر اس کے دیکھتے دیکھتے جیسے وہ جوش سے پاگل ہو گیا۔ وہ کسی جنگلی ریچھ کی طرح اس پر جھپٹ پڑا۔ کوثر کی چیخ نکل گئی اور باہر اس وقت وہ چھوٹے سر کا خونخوار بے سخن آدمی ایک وفادار کتے کی طرح عمارت کے چاروں طرف چکر لگا لگا کر پہرہ دے رہا تھا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں لمبی نارنج کے علاوہ ایک بارہ بور کی رائفل بھی تھی جو بھری ہوئی تھی۔

جس وقت وہ عمارت کے تین چار راؤنڈ لگا کر واپس لوٹنے لگا تو اندھیری رات کے سناٹے نے کسی مظلوم عورت کے حلق سے نکلی ہوئی کئی دردناک چیخیں سنیں، لیکن یا تو وہ بہرہ تھا یا پھر اس کے لیے یہ کوئی غیر معمولی یا نئی نہ تھی۔ اس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ بالآخر وہ درد ناک چیخیں اس چار دیواری میں گھٹ کر رہ گئیں۔

اس وقت رات نصف ڈھل چکی تھی۔ نچلی منزل کی ایک کھڑکی پر روشنی کی مخصوص

علامت دیکھ کر چھوٹے سر کا آدمی پلٹ پڑا۔ یہ اس کے مالک کا اشارہ تھا جو اسے طلب کر رہا تھا۔ وہ فوجیوں جیسے بھاری قدم اٹھاتا کوٹھی کے دالان میں داخل ہو گیا۔ پھر ڈرائنگ روم کو عبور کرنے کے بعد کاریڈور سے گزر کر اس نے اس کمرے کے دروازے پر دستک دی، جہاں وہ کوڑ کو چھوڑ کر گیا تھا۔

''آجاؤ۔'' ایک خوفناک سی آواز اندر سے سنائی دی اور وہ مؤدب انداز میں اندر داخل ہو گیا۔ اندر فرش پر ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ اسی معصوم اور خوبصورت لڑکی کی جو ایک گھنٹہ پیشتر بڑے احترام سے اندر لائی گئی تھی۔ چھوٹے سر کے آدمی نے ایک حقارت بھری نظر لاش پر ڈالی اور بندوق ایک کونے میں ٹکا کر ناریج کو اپنے پرانے اوورکوٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ اس کا مالک اس وقت بھی جوش و غضب کے عجیب عالم میں تھا۔ چھوٹے سر کا آدمی اسے اس کیفیت میں دیکھنے کی تاب نہ لا سکا۔ وہ نظریں جھکا کر آگے بڑھتا رہا۔ قالین پر خون ہی خون پھیلا نظر آ رہا تھا اور خود اس آدمی کے جسم پر خون کے چھینٹے سینے تک اڑ کر پہنچے ہوئے تھے۔ دو چار چھینٹے اس کے چہرے پر بھی پڑے تھے۔ وہ ایک ٹک اس لاش کو گھور رہا تھا۔ اس کے قدموں کے پاس ایک تیز دھار والی چمکیلی چھری خون میں لتھڑی پڑی تھی۔ لاش پر داہنی طرف کے سینے کا گوشت غائب تھا اور اس کے نچلے حصے میں کئی زخم پڑے تھے اور خون رس رس کر ناخنوں پر پھیل گیا تھا۔

چھوٹے سر والے آدمی کو جیسے معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے قالین سمیت اس لاش کو لپیٹا اور کندھے پر اٹھا لیا۔ پھر وہ اپنے مالک کی طرف دیکھے بغیر پلٹا اور دروازے سے نکل کر کاریڈور کے دوسرے سرے کی طرف چلنے لگا۔

دوسرے سرے پر ایک کمرے کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہو گیا۔ یہاں اس نے روشنی بھی نہیں جلائی، جیسے یہ راستہ اس کا روز کا معمول ہو۔ پھر وہ کمرے کے دوسری طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اب وہ عمارت کے پچھلے حصے کے تاریک دالان میں چل رہا تھا۔

اس کے بھاری قدموں کی چاپ پختہ دالان میں گونج رہی تھی۔ دالان کے دوسرے سرے پر ایک بند کوٹھری تھی جس کے دروازے پر تالہ پڑا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس نے جیب سے چابی نکال کر اسے کھولا اور اندر داخل ہو کر اسی ہاتھ سے اس نے دروازہ بند کر لیا۔ اس کمرے میں اس نے سوئچ دبا کر روشنی کر لی۔ یہ ایک تقریباً پچیس فٹ چوڑا اور تیس فٹ لمبا کمرہ تھا، جس میں صرف دو روشندان تھے جو کافی اونچائی پر تھے اور ان میں آہنی سلاخوں کے علاوہ شیشے بھی لگے تھے اس کمرے میں عجیب سی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اتنی شدید تھی کہ شاید کوئی دوسرا آدمی یہاں ناک بند کیے بغیر کھڑا نہ رہ سکتا، لیکن تعجب تھا کہ یہ بدبو اس کمرے کے باہر تک نہ پہنچی تھی۔ چھوٹے سر کے آدمی کو تو جیسے اس ماحول سے انس تھا۔ وہ بڑی لاپرواہی سے آگے چلتا رہا۔ کمرے کے درمیان میں ایک تقریباً پانچ فٹ اونچی دیواروں والا چوکور حوض تھا، جس میں بدبودار گندلا پانی بھرا ہوا تھا۔ اس پانی کی سطح پر پھین بھی تھا۔ چھوٹے سر کے آدمی نے قالین سمیت وہ لاش اس حوض میں ڈل دی اور دونوں ہاتھ اس انداز سے جھٹک کر، جیسے اس نے کسی مرے ہوئے کتے کو کسی سرکاری کچرہ گھر کے ڈرم میں پھینکا ہے، وہ حوض کے کنارے پر ہی بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے ایک بیڑی نکالی اور اسے جلا کر پینے لگا۔ وہ تقریباً پندرہ منٹ تک اسی طرح بیٹھا رہا۔ اس کی نگاہیں سامنے دیوار پر اس طرح جمی رہیں جیسے کسی گہری سوچ میں ہو یا ممکن ہے یہ اس کی عادت ہی رہی ہو۔ جتنی دیر وہ لاش اس حوض میں پڑی رہی، گندے پانی میں بلبلے اٹھتے رہے اور اس کا رنگ ہلکا سرخ ہو گیا۔ پانی سے ہلکا ہلکا سا دھواں بھی اٹھ رہا تھا۔

تقریباً بیس منٹ گزر جانے کے بعد وہ اٹھا۔ اس نے دیوار پر ایک کھونٹی میں ٹنگا ہوا سیاہ ربڑ کا دستانہ اتار کر ایک ہاتھ میں پہنا اور ہاتھ حوض میں ڈال دیا۔ دوسرے لمحے اس کے ہاتھ میں اس لاش کی ٹانگ تھی جسے اس نے بے دردی سے باہر کھینچ لیا۔ لاش کو نکال کر اس نے حوض کی ایک فٹ چوڑی منڈیر پر لٹا دیا۔ اس وقت یہ لاش ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے کسی مردہ گھر سے نکالی گئی ہو۔ زخموں کے نشانات ضرور تھے، لیکن پورے جسم پر کہیں خون کی بوند تو کجا

سرخی کا نشان تک نہ تھا۔ پھر اس نے ہاتھ حوض میں ڈال کر اس قالین کو گھسیٹا اور اسے نکال کر حوض کے کنارے پر لٹکا دیا۔ اس پر بھی کہیں خون کا دھبہ تک نہ تھا، جیسے کسی بھٹی سے دھو کر نکالی گئی تھی۔ قالین کو کھونٹیوں کی مدد سے دیوار میں لٹکا کر اسے حوض میں نیچے کی طرف لگا ہوا ایک والو گھما دیا، جس کے ساتھ ہی حوض کا پانی نیچے کی طرف بیٹھنے لگا۔ چھوٹے سر والے نے اب اس لاش کو کاندھے پر اٹھا لیا اور اسی طرح روشنی بجھا کر کمرے کو بند کرتا ہوا باہر سے قفل ڈال کر دالان میں نکل گیا۔ اس دالان کے دوسرے سرے پر بھی اوپر جانے والا زینہ تھا۔ وہ لاش کو کاندھے پر ڈالے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ یہ زینہ اپنا ایک درہ پہلی منزل پر چھوڑتا ہوا عمارت کی چھت تک پہنچتا تھا۔ چھوٹے سر کا آدمی سیدھا چھت پر پہنچ گیا۔ چھت پختہ اور کھلی ہوئی تھی۔ اسے چاروں طرف سے ساڑھے ۳ فٹ اونچی منڈیر نے گھیر رکھا تھا۔ اس کے ایک سرے پر زینے کی چھت والی کوٹھری تھی، جس کا دروازہ چاندنی پر کھلتا تھا اور دوسرے سرے پر ایک تقریباً ۲۰ فٹ لمبی اور اتنی ہی چوڑی کوٹھری بنی ہوئی تھی، جس کا دروازہ کسی گیرج کے دروازے سے مشابہ تھا۔ چھوٹے سر کے آدمی نے اس لاش کو اس بند کوٹھری کے نزدیک چھت پر ڈال دیا اور لاپرواہی سے سر کو جھٹکتا ہوا واپس لوٹ گیا۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

پھول

شام ڈوب رہی تھی جب ایک خوبصورت جوان لڑکی اور ایک خمیدہ کمر بوڑھا آدمی جس کی داڑھی کے بال سفید ہو چکے تھے، ایک چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ چلتا ہوا کلکرنی روڈ پر چھترے ہوئے احاطوں دار بنگلوں کے سرے پر واقع 'رین بو' کے احاطے کے دروازے میں داخل ہوئے۔ رین بو اس علاقے کا سب سے شاندار بنگلہ تھا۔ اس کے کمپاؤنڈ کی قدِ آدم دیوار بھی ماربل کی بنی ہوئی تھی۔ دروازے پر دربان موجود تھا۔ اس نے انھیں دروازے پر روک لیا۔ لڑکی کافی پرکشش حسن و شباب کی مالک ہوتے ہوئے بھی اپنے میلے پھٹے ہوئے کپڑوں میں گندی گندی سی نظر آ رہی تھی۔ ویسے اس میں کوئی شک نہ تھا کہ اگر اسے نہلا دہلا کر صاف لباس پہنا دیا جاتا تو وہ ہزاروں میں ایک معلوم ہوتی۔

''کیا بات ہے؟ کس کو منگتا؟'' نیپالی دربان نے بوڑھے سے پوچھا۔

''یہاں کون رہتا ہے، بھیا؟'' بوڑھے نے نرم اور کانپتی آواز میں پوچھا۔

''تم کو مالم نہیں، اس بنگلے میں سرگزدو رہتا ہے۔''

''سرگزدر کا بنگلہ یہی ہے۔'' بوڑھا خوشی سے اچھل کر بولا۔ ''وہ تو بڑے دیالو اور رئیس ہیں۔''

''ہیں تو تم کو کیا کرنے کا ہے؟'' گورکھے دربان نے حقارت بھری نظر ڈال کر اینٹھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ایسا سبو سے شام تک اور کتنا لوگ مدد مانگنے آتا ہے۔ سب یہی بولتا ہے۔ ہمارا سیٹھ کا دیوالہ نکلوائے گا تم لوگ۔''

''بھیا، تمہارا بڑا احسان ہوگا۔ میری بیٹی نے کل سے کھانا تک نہیں کھایا ہے۔ ہم لوگ بہت غریب ہیں۔ مصیبت میں ہیں۔ ہمیں بھی ان سے کچھ دلوا دو۔'' بوڑھا آدمی دربان

کی خوشامد کرنے لگا۔ دربان نے ایک بار للچائی ہوئی نظروں سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے حسن سے متاثر ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، لیکن اس کے خوبصورت سڈول جسم پر اس کی نظریں دو تین بار دوڑیں اور اس کی رال ٹپکنے لگی۔

''اچا اچا۔ ابھی سیٹھ آئے گا تم کو ام اندر کر دے گا اُدر بیٹھ جاؤ۔'' گورکھے نے وعدہ کیا اور بوڑھا آدمی معصومیت سے پھاٹک کے قریب بنی ہوئی دربان کی چوکی کے نزدیک اپنی بیٹی سمیت بیٹھ گیا۔ گورکھا اس کی لڑکی کو نظریں چرا چرا کر گھورتا جاتا۔ اس کی آنکھوں میں جنسی بھوک جھلک رہی تھی۔ مگر اسے اس نظارہ بازی کا زیادہ موقع نہیں ملا، کیونکہ مالک کی کار کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ یہ ایک سرخ و زرد رنگ کی لمبی لمبی شاندار لینڈ ماسٹر تھی اور سرگزدر کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ ایسی ایسی گاڑیاں وہ چاہتے تو بیک وقت کئی رکھ سکتے تھے۔ ان کے پاس ملکی اور غیر ملکی سگریٹوں کی تھوک ایجنسی تھی۔ اس کے علاوہ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس بھی کافی لمبا چوڑا تھا۔ وہ شہر کے چوٹی کے رئیسوں میں شمار ہوتے تھے۔ قومی کاموں میں ان کے چندے جاتے اور ان کی شہرت سن کر اکثر غریب اور ضرورت مند لوگ امداد مانگنے بھی آ پہنچتے جو زیادہ یا کم انھیں مل ہی جاتی۔ ایک غیر مصدقہ خبر یہ تھی کہ ان کا موتیوں کا بھی بیوپار ہے، لیکن بہر صورت وہ شہر کی ایک معزز اور صاحب اثر ہستی تھے۔ ان کی ہر سوسائٹی میں عزت ہوتی تھی، کیونکہ شریف اور با اخلاق ہونے کے ساتھ ساتھ وہ فراخ دل اور فراخ دست بھی مشہور تھے۔ مگر اس قدر ہوتے ہوئے بھی وہ علیحدگی پسند واقع ہوئے تھے۔ بہت کم لوگوں سے ملتے، بہت مختصر گفتگو کرتے۔ زیادہ تر جلسوں یا تقریبات میں یا تو ان کا کوئی آدمی نمائندہ بن کر چلا جاتا یا مبارکباد کے خط کے ساتھ کوئی تحفہ یا عطیے کا چیک۔ ان کی ان خصوصیات نے ان کی شخصیت کو اور زیادہ وزنی اور پر اثر بنا دیا تھا۔ ابھی ایک مہینہ قبل ہی وہ ایک سال تک غیر ممالک کا دورہ کرنے کے بعد ہندوستان لوٹے تھے اور تب سے ان کی سخاوتوں کا سلسلہ پھر جاری ہو گیا تھا۔ ان کا شہری ماحول پر اتنا اثر تھا کہ بڑے بڑے سرکاری حکام بھی ان کے مداح یا ان سے مرعوب

تھے۔ان کی جائدادیں بھی شہر میں کافی پھیلی ہوئی تھیں، لیکن یہ سارا وقار انھوں نے اپنی ۴۰ سالہ زندگی میں ہی حاصل کرلیا تھا۔دوسری جنگِ عظیم کے دنوں میں ہی انھیں سر کا خطاب ملا تھا، لیکن چالیس سال کی اس تندروست اور سرخ وسفید شخصیت کو دیکھ کر کوئی بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوتا کہ ان کی عمر واقعی اتنی ہوگی۔وہ زیادہ سے زیادہ تیس ۳۲ سال کی عمر کے جوان آدمی نظر آتے تھے اور ان کے بارے میں یہ روایات بھی مشہور تھیں کہ اگر وہ سرگزدر ہونے کی بجائے فلمی ہیرو ہوتے تو شاید رومان پسند لڑکیاں انھیں اپنے خوابوں میں بسالیتیں۔ویسے بھی ان کا ہنستا ہوا چہرہ اور میٹھی زبان کسی کا دل جیت لینے کے لیے کافی تھا۔یا ممکن ہے ان کی کامیابی کا راز ہی ان ہی خصوصیتوں میں مضمر رہا ہو۔

''صاب۔'' گورکھے نے کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہنے والے انداز میں سلیوٹ کرتے ہوئے کہا۔

سرگزدر نے کار کمپاؤنڈ میں داخل کرتے ہوئے تقریباً روک دی۔گورکھے پر سے ہوتی ہوئی ان کی نظریں اس لڑکی پر جا کر رک گئیں۔

''کیا بات ہے، گورکھا؟'' انھوں نے نرم لہجے میں پوچھا۔''یہ لوگ کون ہیں؟''

''صاب، مصیبت کا مارا لوگ ہے۔آپ کا مہربانی چاہتا ہے۔'' گورکھے نے لہجے میں ضرورت سے زیادہ لجاجت پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا، بھیج دو اندر۔'' یہ کہہ کر سرگزدر نے کار آگے بڑھادی۔

سرگزدر کے چلے جانے کے بعد گورکھے نے ان لوگوں کو بتایا کہ اس نے سرگزدر کی کتنی خوشامد کی ہے کہ وہ ان مظلوموں کی مدد کریں۔پھر انھیں اندر جانے کی ہدایت کرتے ہوئے اس نے یہ بھی بتادیا کہ اس کا یہ احسان بھلایا نہ جائے۔بوڑھے آدمی نے اس کا بہت سا شکریہ ادا کیا اور لڑکی اسے چور نظروں سے دیکھ کر مسکرادی۔بیچارہ گورکھا ریشہ خطمی ہوگیا۔ان لوگوں کے پورٹیکو کی طرف چلے جانے کے بعد دیر تک وہ اس لڑکی کا تصور کرکے آپ ہی آپ

شرماتا رہا۔آخر انسان تھا اور وہ بھی وطن سے دور، عہدِ شباب میں۔

سرگزدر کا کم از کم تین ٹن وزن والا مینڈک نما سکریٹری شاید مالک کی ہدایت پا چکا تھا، وہ ان کا منتظر ہی تھا۔جب وہ پورٹیکو میں اجنبیوں کی طرح اس شاندار بنگلے کی ایک ایک چیز سے مرعوب ہوتے ہوئے داخل ہوئے تو لڑکی کے اندازِ خرام پر موٹے سکریٹری کی نظریں لوٹنے لگیں۔وہ کبھی اس کے خوبصورت چہرے کو دیکھتا اور کبھی اس کے لوٹ لینے والے لہراتے اندازِ خرام کو۔

''ادھر آیئے آپ لوگ۔''اس نے ایک کمرے کی طرف ان کی رہنمائی کی۔یہ شاید ملاقاتیوں کا کمرہ تھا۔یہاں ایک نیا اور خوبصورصوفہ سیٹ لگا ہوا تھا اور اس کے دائیں بائیں گدے دار کرسیاں بھی لگی تھیں۔

''یہاں بیٹھیے۔سرگزدر ابھی آپ لوگوں کو طلب فرمائیں گے۔''وہ یہ کہہ کر چلا گیا۔ لڑکی نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے بوڑھے باپ کی طرف دیکھا۔

''دل والا رئیس معلوم ہوتا ہے۔''بوڑھے آدمی نے سرگزدر کی تعریف کی۔سکریٹری دو منٹ سے کم کے وقفے میں پھر آ پہنچا۔

''کچھ وقت لگے گا۔سرگزدر تھکن اور گرمی کی وجہ سے غسل خانے میں تشریف لے گئے ہیں۔تب تک آپ لوگ مناسب سمجھیں تو منہ ہاتھ دھولیں۔کافی دور سے آئے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔''سکریٹری نے بڑے خلیق لہجے میں کہا۔لیکن مخاطب میں زیادہ جھکاؤ لڑکی کی طرف ہی تھا۔

''خدا سرگزدر کی عمر و اقبال میں ترقی دے۔جیسے مالک ویسے ہی ان کے آدمی۔'' بوڑھے آدمی نے سکریٹری کی تعریف کی اور وہ فٹ بال کی طرح پھولے ہوئے پر بھی اور پھول گیا۔اس نے اس کمرے سے ملحق 'اوول' کی طرف ان کی رہنمائی کی۔پہلے بوڑھا ہاتھ منہ دھونے اندر چلا گیا۔لڑکی اکیلی باہر رہ گئی۔

''یہ آپ کے کون ہیں؟'' سکریٹری نے لڑکی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

''میرے پپا۔'' لڑکی نے بچوں جیسا منہ بنا کر معصومیت سے کہا۔

''ہائے۔'' سکریٹری کے منہ سے آہستہ سے نکلا۔ تھی بھی قربان ہو جانے والی ادا۔ وہ پہلے ہی ملاپ پر ذبح ہونے لگا۔ حالانکہ لڑکی کے انداز میں نہ تو کوئی چھچھورا پن تھا نہ بے تکلفی۔ اس کی معصومیت کا اظہار ہی اسے اور قاتل بنائے دے رہا تھا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' سکریٹری نے ذرا اور آگے بڑھ کر پوچھا۔

''ٹوں ٹوں۔'' لڑکی نے کسی قدر توتلا کر معصومیت سے کہا۔

''کیا...؟''

''پپا یہی کہتے ہیں۔ ویسے میرا نام پھول بیگم ہے۔''

''پھول بیگم۔'' عالمِ تخیل میں ایک لمبی سانس کے ساتھ اسے سونگھتے ہوئے سکریٹری نے دہرایا۔ ''واقعی؟''

''کیا واقعی؟'' لڑکی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

''آپ... آپ پھول ہی جیسی تو ہیں۔''

''سچ...'' لڑکی یہ کہتی ہوئی اپنی ایک ایڑی پر پوری گھوم گئی اور اس کا یہ الھڑ پن سکریٹری کو اور مضطرب کر گیا۔

''کیا نوکری کرو گی یہاں؟'' سکریٹری نے تقریباً رازدارانہ لہجہ اختیار کر کے پوچھا۔ جس کے جواب میں وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ لڑکی منہ بسور کر رونے لگی۔

''نوکری کرے میری جوتی۔'' اس نے منہ لٹکا کر کہا۔ ''پپا...'' اس نے منہ پھر کر بچوں کی طرح پکارا۔ اور اسی وقت اس کا باپ بھی باہر نکل آیا۔ وہ تولیے سے اپنا منہ پونچھ رہا تھا۔

Akram Allahabadi

''کیا ہوا، بیٹی؟'' اس نے پوچھا۔

''انھیں کچھ ہو گیا ہے۔'' وہ بھولے پن سے سکریٹری کی طرف انگلی اٹھا کر بولی۔

''کیا ہوا، حضور، آپ کو؟ کیا ہوا؟'' بوڑھا خوشامدانہ انداز میں گھبرا کر پوچھنے لگا۔

''کک کچھ تو نہیں۔'' سکریٹری گھبرا سا گیا۔

''کہتے تھے آپ پھول جیسی ہیں۔'' لڑکی نے اسے بتایا۔

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ ٹھیک ہی تو کہتے تھے۔'' بوڑھے نے بیٹی کو چمکار کر کہا۔

''واہ، پھول اتنا سا، میں اتنی بڑی، ٹھیک کیسے ہوا۔ آپ بھی مجھے بناتے ہیں۔ میں کوئی بچی تھوڑی ہوں۔'' لڑکی برا ماننے والے انداز میں کہنے لگی۔

''ارے نہیں، بیٹی۔ وہ تو تمہاری تعریف کر رہے ہوں گے کہ تم پھول کی طرح خوبصورت ہو۔'' بوڑھا پھر چمکارتے ہوئے بولا۔

''ہل... بالکل یہی بات۔'' سکریٹری نے تائید کی۔

''دھت۔'' لڑکی نے نوجوانوں کی ایک پوری بٹالین کو قتل کر دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ شرمیلی آنکھوں سے سکریٹری کو گھورتے ہوئے یہ الفاظ کچھ اس طرح ادا کیے کہ سکریٹری کچھ دیر تک بت بنا کھڑا رہ گیا اور وہ دروازہ کھول کر 'اوول' میں چلی گئی۔ سکریٹری کھویا کھویا سا کھڑا دیکھتا رہا۔

جس وقت وہ منہ دھو کر باہر نکلی تو کچھ اور ہی عالم تھا۔ گورے گورے چہرے اور خوبصورت نقش و نگار کے ساتھ اس کا حسن دوبالا ہو گیا تھا۔ سکریٹری اس کے بوسیدہ لباس کے باوجود اس کے اس سحر انگیز حسن سے مرعوب ہو گیا۔ وہ کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ گھنٹی بجی اور وہ چونک پڑا۔ اسے انھیں چھوڑ کر جانا پڑا، مگر وہ جلد ہی لوٹ آیا۔

''چلیے، طلبی ہوئی ہے۔'' اس نے اشارہ کیا اور دروازہ کھول دیا۔ پہلے بوڑھا اندر گیا اس کے بعد جب لڑکی اندر جانے لگی تو سکریٹری نے آہستہ سے اس کا ایک ہاتھ تھام کر دبا تے

ہوئے کہا۔

''ہمیں بھول نہ جانا۔''

''بھولتا کون ہے۔'' وہ بڑے ناز سے پلٹ کر بولی۔ ''میں تمہیں چچا کہا کرونگی۔'' وہ کہتی ہوئی وہ سکریٹری کو غرقِ دریائے فکر چھوڑ کر باپ کے پیچھے اندر چلی گئی۔

یہ ایک بہت شاندار ڈرائنگ روم تھا جس کا فرش ریشم کی طرح ملائم دبیز ایرانی قالین کا تھا۔ صوفوں پر مخمل کے غلاف چڑھے ہوئے تھے۔ کمرے میں تیز مگر ٹھنڈی روشنی دیوار گیر کارنر شیڈس نے نکل کر پھیل رہی تھی۔

ان کے سامنے ایک گہرے رنگ کا خوبصورت اور تندرست آدمی صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک ملازم پاس ہی مؤدب کھڑا ہوا تھا جو اشارہ پاتے ہی باہر چلا گیا۔

''بیٹھیے۔'' سرگزور نے اشارہ کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔ اور وہ دونوں جھجکتے ہوئے سامنے کے صوفے پر بیٹھ گئے۔ سرگزور کی تیز نظروں نے ایک بار لڑکی کے چہرے کا جائزہ لیا اور پھر بوڑھے کی طرف مخاطب ہو گیا۔

''ہاں، فرمایئے؟''

''مم... میں... ح... حضور، حیدرآباد سے آیا ہوں... ایک غریب آدمی...'' بوڑھے آدمی نے اس کی شخصیت سے مرعوب گھبرائے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''کیا چاہتے ہیں آپ؟'' سرگزور نے پوچھا۔

''میں اپنی لڑکی کو لے کر اپنے رشتے داروں کے پاس آباد ان جانا چاہتا ہوں، لیکن... لیکن...'' وہ کہتے کہتے اٹکنے لگا۔

''کہیے، کہیے۔'' سرگزور نے ہمت دلائی۔

''لیکن ہمارے پاس کرایہ نہیں ہے۔'' بوڑھے آدمی نے کہا۔

''کب جانا چاہتے ہیں آپ؟''

Akram Allahabadi

"آپ کی مہربانی پر منحصر ہے۔"

"اچھا، لیکن یہاں ٹھہرے کہاں ہیں آپ؟"

"ابھی تک کوئی ٹھکانہ نہیں۔ آج ہی ہم لوگ یہاں پہنچے ہیں۔ اسٹیشن پر ہی ایک اللہ کے بندے نے حضور کا پتہ بتا دیا تھا، اس لیے بڑی امیدیں لے کر آئے ہیں حضور کے پاس۔"

"خیر، آپ لوگ یہیں ٹھہریے، میں سکریٹری سے کہہ کر آپ لوگوں کے جانے کا انتظام کروں گا۔" سر گزور نے مظاہرۃً التفات کیا۔

"یہ... یہی آپ کی لڑکی ہے؟" سر گزور نے اس سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ یہی غلام زادی ہے۔" خوشامد ابوڑھے آدمی نے کہا۔

"دھت۔" لڑکی نے باپ کی طرف دیکھ کر ایک نظر سر گزور پر ڈالتے ہوئے اسی محبوبانہ انداز سے کہا جس پر سکریٹری پہلے ہی شہید ہو چکا تھا۔ سر گزور کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے کچھ عجیب سی سرخی دوڑی اور معدوم ہو گئی۔

"تمہارا نام کیا ہے لڑکی؟"

"پھول۔" لڑکی نے شرما کر اپنے گورے چٹے خوبصورت پیر کے انگوٹھے سے قالین کو ادھیڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"پھول۔" سر گزور نے کسی قدر متاثر لہجے میں دہرایا۔

"بیگم۔" لڑکی نے نام کا باقی ٹکڑا پورا کر دیا۔

"اوہ، پھول بیگم۔" سر گزور نے اپنی بے باک نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ "بہت اچھا نام ہے۔"

"سائچ۔" لڑکی نے سچ کو لمبا کھینچ کر خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا اور اس ادا پر سر گزور بھی کچھ مبہوت سے ہو گئے۔

"جیسی پھول سی آپ کی بیٹی، ویسا ہی نام۔"

Akram Allahabadi

''اللہ قسم۔آپ بڑے اچھے ہیں۔'' اٹھ کر وہ سرگزدر کے گورے ہاتھوں پر طمانچہ مار کر ہنس پڑی۔

''بہت معصوم ہے۔اتنی بڑی ہوگئی ہے، مگر بات کرنے کی تمیز نہیں۔'' بوڑھے نے بات بنانے کے لیے کہا۔لیکن اس وقت سرگزدر کے بشرے پر کچھ ایسی جذباتی کیفیت نمایاں تھی کہ جسے صحیح طور سے سمجھنا مشکل تھا۔سرگزدر نے میز پر لگا ہوا گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔سکریٹری فوراً ہی اندر آ پہنچا۔

''پچھلے خالی کمروں میں سے کسی میں ان لوگوں کے ٹھہرنے کا انتظام کردو۔انھیں آباد ان بھیجنا ہے۔'' سرگزدر نے حکم دیا۔

''بہت بہتر۔'' سکریٹری نے جو سرگزدر کی شخصیت سے شاید ضرورت سے زیادہ خائف سا رہتا تھا ادب سے سر جھکائے ہوئے کہا اور بوڑھے کی طرف رخ کر کے، تشریف لایئے، کہتا ہوا ان کی رہنمائی کرنے لگا۔ان لوگوں کے کمرے سے نکل جانے کے بعد سرگزدر اٹھ کھڑا ہوا۔اس میں اس وقت ایک عجیب سی تبدیلی پیدا ہوگئی تھی۔اس کا چہرہ بتدریج سرخ ہوتا جا رہا تھا۔اور وہ بار بار اپنی مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔پھر اس کی نظریں دیوار گیر کلاک کی طرف اٹھ گئیں۔اس میں ابھی صرف ساڑھے سات بجے تھے۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

پٹھان کا اغوا

ایک جگہ مجمع لگا کر دوسری جگہ پر اپنا ڈیرا لگنے کے لیے دوا دارو خان اور جونا خان اپنے تھیلے کندھے پر لادے لاپرواہی سے چلتے ہوئے بازار میں سے گزر کر ایک تنگ سی گلی میں داخل ہو گئے۔ سرکاری لالٹینوں کی مدھم روشنی میں یہاں چھوٹی چھوٹی دکانیں کافی فاصلے سے واقع تھیں اور گلی تقریباً سونی تھی۔ آگے چلتے چلتے نوجوان خان اچانک ایک دکان کے چبوترے کا سہارا لے کر جھک گیا اور اپنے جوتے کا بند باندھنے لگا، مگر ترچھی نظر سے وہ اس مٹیالے سے انسانی سائے کو دیکھ رہا تھا جو بازار ہی کافی فاصلے پر رہ کر ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ نوجوان خان پھر آگے چلنے لگا، مگر جونا خان کی نظریں بھی تعاقب کرنے والے سے غافل نہ تھیں۔ وہ اسی طرح چلتے ہوئے گلی کے دوسرے موڑ پر آ گئے۔ پھر وہ تیزی سے ایک دوسری سڑک پر گھوم گئے۔ یہ بھی نیم تاریک مگر چوڑائی میں زیادہ تھی۔ گلی کے کونے پر رک کر جب جونا خان نے جھانک کر دیکھا تو ان کا تعاقب کرنے والا سایہ غائب ہو چکا تھا۔

''کوئی تعاقب تو ضرور کر رہا تھا۔'' نوجوان خان نے ساتھی سے آہستہ سے کہا۔

''شاید دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہو۔'' جونا خان نے جواب دیا۔

''تو پھر ہمیں اس سڑک کے دونوں سمتوں پر بٹ جانا چاہیے۔ وہ دوسری کسی گلی سے اسی سڑک پر آگے یا پیچھے نکلنے کی کوشش کرے گا۔ اس طرح ہم میں سے ایک محفوظ رہ کر اس کی پشت پر آ جائے گا۔''

چنانچہ وہ مختلف سمتوں میں بٹ گئے۔ ایک آگے کی طرف چلنے لگا، دوسرا پیچھے کی طرف۔ آگے کی طرف جانے والا جو نوجوان خان تھا۔ وہ کافی محتاط ہو کر چل رہا تھا۔ اس سڑک پر کئی چھوٹی چھوٹی گلیاں پھوٹتی تھیں اور ہر گلی کے سرے پر وہ قلیل سے وقفے کے لیے رک جاتا

اور جب آگے بڑھتا تو اس سے پہلے اس گلی میں جھانک کر اطمینان کر لیا، لیکن ابھی وہ بمشکل ایسی دو گلیاں ہی عبور کر پایا تھا کہ کوئی وزنی سی سخت چیز سنسناتی ہوئی پشت سے آ کر اس کی پیٹھ پر لگی اور وہ اوندھے منہ گر پڑا۔ پھر اس سے قبل کہ وہ سنبھلے ایک انسانی سایہ پشت سے اس پر اچھل کر گرا اور اس نے اپنے مضبوط ہاتھ سے نوجوان خان کا منہ اور ناک بند کر لیے۔ اس کی انگلیوں کے درمیان ایک سفید رومال دبا ہوا تھا، جس کی بو دماغ میں پہنچتے ہی نوجوان خان پر بیہوشی طاری ہونے لگی۔ وہ یقیناً کلوروفارم تھا۔ اس سائے نے جو کافی بڑے ڈیل ڈول کا ایک تندرست آدمی تھا اور جس کے بڑے جسم پر اس کا چھوٹا سا گھٹا ہوا سر اپنی امتیازی حیثیت رکھتا تھا بیہوش پٹھان کو اپنے کاندھے پر اس طرح اٹھا لیا، جیسے کوئی دیہاتی کاندھے پر رومال ڈال کر چل رہا ہو۔ وہ کافی تیز رفتار سے چل کر ایک تیسری اندھیری گلی میں داخل ہو گیا۔ یہاں سناٹا تھا۔ اس گلی کے موڑ پر کھڑا ہو کر وہ کسی کا انتظار کرنے لگا۔ اتنے میں اس سڑک پر پچھلی سمت سے ایک لمبی سیاہ کار رینگتی ہوئی آ پہنچی۔ اسے دیکھتے ہی چھوٹے سر کا آدمی آڑ سے نکل آیا۔ کار رک گئی اور اس کا پچھلا دروازہ کھول دیا گیا۔ چھوٹے سر کے آدمی نے بیہوش خان کو پچھلی نشست پر ڈال دیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ جونا خان اب تک پیچھے کہیں بھٹک رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

آج شہر کے مغربی علاقے کو جھیل ڈونگرا سے پانی کی سپلائی عارضی طور پر بند کر دی گئی۔ یہ پانچویں لاش تھی جو جھیل ڈونگرا سے دستیاب ہوئی تھی۔ اس کی حالت بھی خراب تھی۔ اسے پہچاننے میں کوئی زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ اسے ایک سفید کپڑے سے ڈھانک دیا گیا تھا۔ صرف اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ سیٹھ کرم علی نے اپنی بیٹی کو پہچان لیا۔ وہ کوثر کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ پولیس کمشنر خود اس لاش کے سرہانے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر گہرے تفکر کی علامتیں

نمایاں تھیں۔وہ اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچے ہوئے تھا۔

''یہ سب کچھ میری ہی دی ہوئی آزادی کا نتیجہ ہے۔'' کرم علی بڑبڑائے۔اب معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دشتِ غم سے مغلوب ہوکر دل ہی دل میں اپنے آپ پر لعنت بھیج رہے ہوں۔''ایسے ماں باپ کو ایسی ہی سزا ملنی چاہیے۔'' انھوں نے رومال کے کونے سے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔

''تعجب ہے کہ ان وارداتوں کا سلسلہ ابھی تک بند نہیں ہوسکا۔کیا ہمارے پولیس اتنی نکمی ہوچکی ہے۔'' کمشنر کا مخاطب اب ڈی سی پی تھا۔

''سپرنٹنڈنٹ خان کا کل سے پتہ نہیں۔میرا خیال ہے وہ ضرور اسی سلسلے میں کہیں گم ہیں۔'' ڈی سی پی نے جواب دیا۔

''آخر آج پانی بند کردینے کی نوبت آ گئی۔اب پولیس پر اخباروں اور پبلک میں جو کچھ بھی کیچڑ اچھالی جائے کم ہے۔'' کمشنر کا لہجہ تشویش زدہ تھا۔

''ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے پاس علاؤالدین کا چراغ نہیں ہے۔'' ڈی سی پی بھی اس بوچھاڑ سے تنگ آ کر بولا۔''آخر سب طرف تو پولیس نے ہاتھ پھیلا رکھے ہیں۔''

''لوگ اس قسم کے جواب سے مطمئن نہیں ہوں گے۔''

''پھر مجبوری کا دوسرا نام صبر۔''

اس لاش اور اس طرح پائی جانے والی دوسری پچھلی لاشوں کی ہیئت میں کوئی فرق نہیں تھا۔اس لیے اس کا معائنہ کرنے کے بعد وہ اپنی کار میں بیٹھ کر پولیس ہیڈ کوارٹرز کی طرف روانہ ہوگئے اور کوثر کا غم زدہ باپ آخری رسوم کی ادائیگی کے لیے بیٹی کی لاش کے حصول کی جدوجہد کرنے لگا۔

یہ جوان موتیں کس کے لیے افسوسناک نہ تھیں، سارے شہر میں تہلکہ مچ گیا اور اب تو شارع عام پر پولیس کو گالیاں پڑنے لگیں۔کہیں کہیں تو لوگ مشتعل ہوکر جلوس کی شکل اختیار

کر لیتے۔اس اشتعال کو کنٹرول کرنے کے لیے پولیس کو دوسرے انتظام کرنے پڑے۔ڈونگرا جھیل کی سپلائی بند کرنے سے پانی کی جو قلت پیدا ہوئی اسے پانی تقسیم کرنے والی سرکاری ٹینکر گاڑیاں بھی دور نہ کر سکیں۔جگہ جگہ کنوؤں اور دوسرے علاقوں کے نلوں پر جھگڑے شروع ہو گئے۔غرضیکہ ایک عجیب سا ہیجان شہر بھر میں پھیل گیا اور یہ سب کچھ نتیجہ تھا محض کسی خوفناک مجرم کے اس جنون کا جس نے نتائج کی پرواہ کیے بغیر ہزاروں بے گناہ جانوں کو مصیبت میں ڈال دیا تھا۔

تمام علاقے چھان مارنے کے باوجود سپرنٹنڈنٹ خان کا کوئی پتہ نہ چلا۔پولیس کا باقی عملہ اس سے زیادہ اور کچھ نہ کر سکا کہ جھیل پر خفیہ نگرانی اور زیادہ سخت کر دی گئی۔شہر میں حفظِ امن کے لیے مسلح پولیس کو بھی متعین کر دیا گیا اور شہر کے تمام خطرناک قسم کے جرائم پیشہ افراد پر کڑی نظر رکھی جانے لگی۔اب تک پائی جانے والی تمام لاشیں کیونکہ کافی خوبرو اور جوان لڑکیوں کی تھیں،اس لیے پولیس کے دوسرے حکام بھی صرف یہی رائے قائم کر سکے کہ یا تو کوئی پراسرار قسم کا ضدی مجرم ان معصوم جوانیوں سے کوئی جذباتی انتقام لے رہا ہے یا وہ کوئی انتہائی خطرناک قسم کی عورت ہی ہو سکتی ہے جو کسی خاص وجہ سے اپنی ہم جنسوں کو تباہ کرنے پر تلی ہو۔

لیکن دوسرا خیال قرینِ قیاس نہیں تھا۔کیونکہ ایک عورت کے ہاتھوں ایسے پراسرار اور بہیمانہ جرائم کا سرزد ہونا قطعی غیر فطری اور ناقابلِ قبول تھا۔خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ قانون کے محافظ خود اب تک اس نامعلوم طاقت کے بارے میں کوئی ذرا سا بھی سراغ نہ لگا سکے ہوں۔بہر حال سو منہ تھے اور سو باتیں۔بلکہ ناخواندہ عوام میں تو اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو اسے ڈونگرا جھیل کا ہی کوئی آسیب قرار دے رہے تھے۔

دوپہر کا وقت تھا اور گھڑیال بھی ڈیڑھ بجا رہی تھی کہ وائرلیس پر سپرنٹنڈنٹ خان کا کوڈ میسج موصول ہوا۔آپریٹر نے خان کی آواز سنتے ہی پولیس کمشنر سے سلسلہ قائم کر دیا۔کمشنر اس وقت سخت بے چین تھا۔

''آخر آپ کہاں سے بول رہے ہیں۔ یہاں کس شدت سے آپ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔'' کمشنر نے پوچھا۔

''میں کہاں ہوں، اس کا انکشاف سر دست نہیں کر سکتا، لیکن میں آپ سے ایک فوری اقدام کی اجازت چاہتا ہوں۔''

''کس اقدام کی؟''

''میں چاہتا ہوں کہ سرگز در کا وارنٹ گرفتاری جاری کر دیا جائے، فوراً۔''

''سرگز در کا؟'' کمشنر اس طرح اچھلا جیسے اس کے سامنے سے کوئی زہریلا سانپ رینگ گیا ہو۔

''آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے نا؟'' کمشنر نے اس سے پوچھا۔ ''آپ کس شخصیت کے بارے میں کہہ رہے ہیں؟''

''یہ میری ذمے داری ہے۔''

''لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ کے کسی مغالطے کی وجہ سے پولیس اپنے اوپر یہ رسک نہیں لے سکتی۔''

''سرگز در بہت بااثر شخصیت ہیں۔''

''کیا آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں؟''

''اس کے باوجود میں سرگز در جیسی بڑی شخصیت کے بارے میں کوئی ایسا فیصلہ بغیر کافی ثبوت کے نہیں کر سکتا۔''

''عجیب مصیبت ہے۔'' خان بڑبڑایا۔

''آپ کیا انھیں بھی اس سلسلے سے متعلق سمجھ رہے ہیں؟''

''یہ بات اسی وقت ثابت ہو سکتی ہے جب انھیں گرفتار کر لیا جائے۔''

''تو پھر میں مجبور ہوں۔ آپ اپنے شبہات کی تسکین کے لیے کوئی اور طریقہ کار

Akram Allahabadi

اختیار کیجیے۔ ویسے مجھے آپ کی رپورٹ کا انتظار ہے۔ شہر میں بے چینی بہت بڑھ چکی ہے۔"

"بہتر ہے۔" خان نے جواب کا انتظار کیے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا اور کمشنر سنجیدگی سے میز پر کہنیاں ٹیک کر کچھ سوچنے لگا۔ یہ کیفیت بمشکل دو منٹ تک رہی۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے چلتا ہوا آفس سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

گونگا دیو

بوڑھے غریب مہمان اور اس کی چنچل خوبصورت لڑکی کے ساتھ مہمان نوازی میں کوئی امتیاز نہیں برتا گیا۔ انھیں سویرے بہترین ناشتہ اور دوپہر کو وہی کھانا دیا گیا جو سرگزدر کی میز پر چنا گیا تھا۔ دوپہر کے بعد بوڑھا تو آرام کرنے کے لیے اس کمرے میں چلا گیا جو بنگلے کی پشت پر ایک کونے میں بنا ہوا تھا اور جو انھیں وقتی طور پر قیام کرنے کے لیے دیا گیا تھا، لیکن اس کی بیٹی پھول پچھلے سُونے برآمدے میں ٹہلنے لگی۔ اس نے نہا دھو کر اس وقت کپڑے بدل لیے تھے۔ یہ کپڑے اگرچہ بالکل سادہ اور معمولی تھے، لیکن اس کا حسن اور اس کا پرکشش شباب اس لباس میں بھی کھلا پڑ رہا تھا۔ وہ موسمِ بہار کی حسین تتلی کی طرح برآمدے میں تھرکتی پھر رہی تھی۔ اچانک برآمدے کے دوسری طرف دیوار کے آڑ سے ایک چوڑا مردانہ ہاتھ باہر نکلا اور جیسے ہی وہ قریب آئی، اس نے اسے بازو سے تھام کر دیوار کی آڑ میں کھینچ لیا۔ اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی، کیونکہ کھینچنے والے نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ سرگزدر کا سکریٹری تھا۔

''تم؟'' لڑکی نے اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

''ہاں۔ تم سے ایک خاص بات کہنی ہے۔'' وہ رازداری کے لہجے میں بولا۔

''تو ویسے ہی بلا لیا ہوتا۔''

''تم نہیں سمجھ سکتیں۔ ہوسکتا ہے کہ سرگزدر کی آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی ہوں، پھر ہم دونوں کی خیر نہ رہتی۔'' وہ چونک کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سرگوشی کے لہجے میں بولا۔

''واہ، وہ تو بہت اچھے آدمی ہیں۔''

''ہیں، مگر بہت سخت۔''

''میں تو انھیں پسند کرتی ہوں۔ کتنے خوبصورت، کتنے ہنس مکھ، کتنے نیک اور

مہربان۔"

"شاید۔" وہ بڑبڑایا۔

"کیوں؟ شاید کیوں؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم، مگر میرا دل نہیں مانتا کہ وہ فرشتہ ہیں۔"

"تم کیا کہنے والے تھے؟" لڑکی نے معصومیت سے اس کے چہرے پر نگاہیں گاڑ کر پوچھا۔

"میں؟" وہ ہچکچایا۔ "دراصل تم... تت... تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔"

"تو اس میں کیا ہوا، میں ہوں ہی اچھی۔" وہ اترا کر بولی۔ اس نے فخر سے اپنا سینہ اتنا ابھار لیا کہ کہ سکریٹری کی روح تک جھرجھری لے اٹھی۔

"ہت تیری کی۔ ارے، تم سمجھتی کیوں نہیں؟"

"کیا؟" وہ بڑے ناز سے بولی۔

"یہی کہ تت... تم، یعنی کہ تم... مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔"

"پہلے بھی تو یہی کہا تھا تم نے، پھر کیا نئی بات ہوئی؟"

"مم میں... اچھا، تم میرے ساتھ شادی کروگی؟"

"شادی...؟ نہ بابا۔" لڑکی نے دونوں کان تھام لیے۔ "ابا جان مجھے توپ سے اڑادیں گے۔"

"کیوں؟"

"وہ کہتے ہیں میں تیری شادی کسی بہت بڑے آدمی سے کروں گا۔"

"تو میں کون سا چھوٹا آدمی ہوں۔ سرگزدر کا سکریٹری ہوں۔"

"ہوگے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔ "مجھے تو چڑی مار نظر آتے ہو۔" اس کے لہجے میں شرارت تھی۔ لیکن اس جملے پر سکریٹری کا منہ لٹک گیا۔

Akram Allahabadi

''بس،اب روٹھ گئے۔پوچ...''لڑکی نے اسے کسی بندر کے بچے کی طرح چمکارا۔

''اچھا تم مجھے پورے گلفام نظر آتے ہو،بس۔''

''تم میرا مذاق اڑا رہی ہو۔''

''اللہ قسم،نہیں۔''

''تو پھر میری بنو گی؟''

''مگر ابا جان۔''

''انھیں میں کسی طرح سمجھا لوں گا۔''

''تم بڑے وہ ہو۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھلا کر آگے بڑھ گئی اور سکریٹری اسے شدت جذبات سے چمکتی ہوئی نظروں سے گھورتا رہ گیا،لیکن ابھی بمشکل ایک گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ وہ گھبرایا ہوا آپہنچا۔پھول اپنے بوڑھے باپ کی ساتھ اس وقت اسی کمرے میں تھی۔بوڑھا سو رہا تھا۔

''تم سے ایک بات کہنا ہے۔''وہ آتے ہی پھول سے بولا۔

''وہی کہ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔''وہ اسے قتل کر دینے والی وزدیدہ نظروں سے دیکھ کر بولی۔

''سرگزدر نے تمہیں ان کی مضافاتی کوٹھی میں ٹھہرائے جانے کا حکم دیا ہے۔''

''کوٹھی میں...واہ۔''وہ خوش ہو گئی۔

''بہت مدت ہوئی ایک اور مہمان لڑکی بھی اسی طرح وہاں ٹھہرائے جانے کو بھیجی گئی تھی،مگر اس کا آج تک پتہ نہیں چلا۔''سکریٹری نے بہت آہستگی سے ادھر ادھر دیکھ کر یہ فقرے ادا کیے۔

''بھاگ گئی ہو گی کہیں۔''پھول نے بھولے پن سے کہا۔

''اف فو...آخر تم سمجھتی کیوں نہیں؟''

Akram Allahabadi

''سب سمجھتی ہوں۔تم جلن سے کہہ رہے ہو۔''

''لاحول ولاقوۃ۔میری بلا سے، جاؤ جہنم میں۔''

یہ کہہ کر وہ بگڑا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور پیر پٹکتا ہوا باہر نکل گیا۔

سہ پہر کے وقت انھیں سرگزدر نے خود اپنے سامنے طلب کر کے ان سے کہا کہ وہ جگہ کی کمی کی وجہ سے انھیں اپنی مضافاتی کوٹھی میں بھیج رہے ہیں۔پاسپورٹ وغیرہ میں ابھی کیوں کہ کچھ دن لگیں گے،اس لیے وہیں ٹھہرنا پڑے گا۔''

جواب میں بوڑھا مہمان عقیدت بھری نظروں اور تشکر آمیز زبان سے ان کا شکریہ ادا کرتا رہ گیا۔

کچھ دیر بعد میں گاڑی آ گئی اور وہ دونوں اس میں سوار ہو گئے۔یہ ایک شیورلیٹ لینڈوباڈی کار تھی،جس کا رنگ مٹیالہ تھا۔اسے ایک کھچڑی بالوں والا دبلا سا آدمی ڈرائیو کر رہا تھا۔

شہر سے گزر کر ان کی کار مضافاتی ہائی وے پر دوڑنے لگی۔یہاں اس قدر سناٹا تھا کہ کہیں کہیں تو پانچ دس منٹ تک کوئی دوسری گاڑی انھیں اس سڑک پر چلتی نظر نہ آتی۔شہر سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر اونچائی پر ایک خطرناک موڑ تھا،جہاں ڈرائیور کو گاڑی اکدم آہستہ کرنی پڑی،لیکن جیسے ہی اس نے گاڑی موڑی،اسے پوری طاقت سے بریک لگا دینا پڑا۔سامنے ایک سیاہ رنگ کی لمبی کار موجود تھی،جس نے راستہ روک رکھا تھا۔اس گاڑی کے پاس ہی ایک ہاتھی کے بچے جیسے ڈیل ڈول کا تندرست آدمی کھڑا تھا۔اس کا سر جسم کی مناسبت سے بہت چھوٹا اور گھٹا ہوا تھا۔آنکھیں باریک اور چمکیلی تھیں۔وہ اس انداز سے چلتا ہوا ان کی کار کے نزدیک آیا،جیسے کوئی چیز یا مدد مانگنے آ رہا ہو،لیکن قریب پہنچتے ہی اس نے جیب سے پستول نکال لیا۔

''اررر...تو تم...ڈاکو...چور...چور چور...ارے کوئی آنا'' بوڑھا مہمان چیخنے لگا،

لیکن اس لڑکی نے ایک سحر انگیز شریر نظر اس چھوٹے سر کے آدم پر ڈالی اور اس طرح منہ چلانے لگی جیسے کوئی بھینس جگالی کر رہی ہو۔ ایک لمحے کے لیے چھوٹے سر والا اسے دیکھتا رہ گیا، مگر پھر جیسے وہ کچھ یاد کر کے چونک پڑا۔ اس نے پستول کا دستہ ڈرائیور کے سر پر اچانک مار دیا اور ڈرائیور اس غیر متوقع مار کی تاب نہ لا کر بیہوش ہو گیا۔ وہ بوڑھا آدمی یہ دیکھتے ہی اس کو گھگھیانے لگا۔

"ہمارے پاس کچھ نہیں ہے، بھائی۔ ہم غریب مسافر ہیں۔ ہم پہ رحم کرو۔ تم تو دیو زاد ہو کسی اور کو پکڑ لینا۔"

لیکن چھوٹے سر والے نے اسے شیروانی کے کالر سے تھام کر باہر نکال لیا اور اسے ایک طرف دھکیل کر وہ پھول کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اس سے ڈری نہیں۔ اسی طرح جگالی کرتی ہوئی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دی اور اس کا حیرت انگیز ردِ عمل یہ ہوا کہ چھوٹے سر والے کی چمکیلی آنکھوں کا خوفناک پن مدھم ہو گیا۔ وہ خود بھی اس کی طرح جگالی کرنے لگا۔ اس نے لڑکی کی کلائی تھامی، لیکن وہ خود ہی باہر آ گئی اور چھوٹے سر والے نے اسے واقعی کسی پھول کی طرح اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ وہ اب بھی مسکرا رہی تھی، بلکہ اس دوسری کالی کار تک پہنچتے پہنچتے اس نے اپنے مرمریں ہاتھوں کی نرم و نازک انگلیوں سے اس کے کھردرے گال پر ایک تھپکی بھی دی، جس پر غیر شعوری طور پر چھوٹے سر والے آدمی کی گرفت اور تنگ ہو گئی، لیکن اس کالی کار تک پہنچ کر اس نے اسے پچھلی سیٹ پر اس طرح ڈال دیا جیسے کوئی کپڑے کی گٹھڑی۔

"ارے، او مردود، میری بیٹی کو کہاں لے جاتا ہے؟ دیو کے بچے۔" بوڑھا چیختا ہوا اس کے پیچھے دوڑا۔ چھوٹے سر والے نے اسے دونوں ہاتھوں سے جکڑ کر اٹھا لیا پھر اس نے اس کار سے ایک رسی نکالی اور اطمینان کے ساتھ اسے سڑک سے کچھ دور گھنی جھاڑی کے پیچھے ایک درخت کے تنے سے باندھ کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ بوڑھے کی آواز گھٹ کر رہ

گئی۔اس کام سے فارغ ہوکر چھوٹے سر کا آدمی پھر لڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔اس نے اس بار اپنا موڈ پھر بدل کر خوفناک کرلیا اور زبردستی جیب سے ایک سفید رومال نکال کر اسے اپنی ناک سے دور رکھتے ہوئے پھول کی ناک سے لگا دیا۔اس نے دو تین لمبی سانسیں لیں اور بیہوش ہونے لگی۔

اب وہ اطمینان سے اس کالی لمبی کار کو ڈرائیو کر رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

دوا دار وخان کی جب آنکھ کھلی تو وہ ایک روشن چھت کے نیچے آراستہ کمرے میں ایک صوفے سے ٹکا ہوا تھا۔کمرہ بالکل خالی تھا،لیکن اس کی سجاوٹ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی صاحب حیثیت کی ملکیت ہے۔

''سبحان تیرا قدرت کا قربان اما را جان۔تو ام کو مرنے کے بعد جنت میں بھیج دیا۔''

نوجوان خان چھت کی طرف نظر کر کے بڑبڑانے لگ۔پھر وہ گھوم پھر کر کمرے کا جائزہ لینے لگ۔پیروں کے نیچے دبیز قالین پر وہ بار بار ٹھوکریں مارتا۔

''قعالین ایرانی، درو دیوار اندستانی۔اوئے کیا فرشتہ لوگ بنایا ہوگا یہ کمرہ۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا آنکھیں بند کر کے دروازے کی طرف چلنے لگا۔لیکن دروازے پر پہنچتے پہنچتے وہ دروازے میں داخل ہونے والے آدمی سے زور سے ٹکرا گیا۔اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''چلغوزے کا بچہ،خدا نے آنکھ جیسا دولت سے محروم کیا تم کو؟'' وہ اس پر بگڑ گیا، لیکن جواب میں چھوٹے سر کا دیو قامت آدمی اسے خوفناک نظروں سے گھورتا رہا۔

''برادر،یہ عجب مقام کدر واقع ہوا ہے؟اس وقت اما را صغیر بضد کیا ہے؟''اس نے چھوٹے سر کے آدمی سے سوال کیا۔

''آں...ہوں...''چھوٹے سر کے آدمی کے منہ سے بھیانک سی آواز نکلی۔

''سبحان اللہ، کیسا عجب کارخانہ... یہ ہاتھی کا مثال ڈیل ڈول اور بکرا کا موافق آواز... آ... آں ...اوئے بے زبان جانور، تمارا تعریف؟'' نوجوان خان نے اس سے پھر پوچھا۔ جھس پر وہ حلق سے بھیانک سی غیر مانوس آواز نکال کر اسے دروازے سے باہر چلنے کا اشارہ کرنے لگا۔

''ایسا بولو کہ ام کو اِدر چلنے کا ہے۔ ولے تمارا زبان کیا ہوا، برادر؟'' وہ دروازے سے باہر نکلتے ہوئے اس سے باتیں کرنے لگا، لیکن چھوٹے سر کے آدمی نے نہ تو اس کی طرف توجہ کی نہ جواب دیا۔ وہ آگے آگے ہولیا اور نوجوان پٹھان اس کے پیچھے چلنے لگا۔

''برادر، تم ام کو ابھی کدر لے جائے گا؟'' وہ یہ پوچھتے پوچھتے رک گیا، جس پر چھوٹے سر کے آدمی نے گھور کر اسے دیکھا اور اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پیچھے کی طرف کھینچنے لگا۔

''اوئے خزیر کا بچہ، یہ کیا بدتمیزی ہے؟ انسان کا موافق بات کرو۔ ام کو گدھے کا مثال کھینچتا کائے کو ہے؟''

لیکن چھوٹے سر کا آدمی شاید گونگا ہونے کے ساتھ ساتھ بہرا بھی تھا۔ اس نے سنا ہی نہیں۔ وہ اسے اسی طرح ہاتھ سے کھینچ کر چلتا رہا۔ ایک لمبے چوڑے سے کمرے سے گزر کر وہ ایک بڑے دروازے میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد ایک اور دروازہ تھا اور اس کے بعد ایک اور۔ چوتھے دروازے میں داخل ہونے کے بعد اس نے دوا دا روخان کا ہاتھ چھوڑ دیا اور ایک طرف ہٹ گیا۔ پٹھان نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ یہ ایک شاندار کمرہ تھا، جس کی چھت میں فانوس لٹک رہے تھے، فرش پر قالین بچھا تھا اور صوفوں پر سرخ مخملی غلاف۔ اور ان میں سے ایک صوفے پر ایک تیس پینتیس سالہ گورے رنگ کا خوبصورت سا تندرست آدمی بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی کے ساتھ ساتھ ایک خاص قسم کی چمک تھی، جو اس سے نظر ملانے والے کو مرعوب کر لیتی تھی۔ دوا دا روخان نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر پلٹ کر چھوٹے سر والے کو، جو

Akram Allahabadi

اس وقت ادب سے سر جھکائے ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔

''تو تم مالک ہوتا اس ہاتھی کا اولاد کا؟ و لے برادر، ام کو ایسا بلانے کا کیا ضرورت تھا؟ خط، چٹھی، تار، ٹیلیفون بھیجا ہوتا۔ ام خود سر کا بل چل کر حاضر ہو جاتا۔'' وہ پٹھان اس پراسرار شخصیت سے مخاطب ہوا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' وہ رعبیلے لہجے میں سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

پھر اس نے اپنا ایک ہاتھ ہلا کر اس چھوٹے سر کے آدمی کو جانے کا اشارہ کیا، جو فوراً ہی باہر نکل گیا۔

''کیا کرتے ہو تم؟'' اس نے اب دوا دار و خان سے پوچھا۔

''جو اللہ توفیق دے۔'' پٹھان بولا۔ ''قوت کا دوا بیچتا ہے۔ کمزوری بخار کا دوا بیچتا ہے۔ کیمیا بنانے سے لے کر کھٹمل مارنے تک کا دوائی امارا پاس ہے۔''

''اور اگر تمہاری دوا بے اثر ہوئی تو؟''

''اوئے ہو توبہ توبہ، پٹھان کا دوا میں اثر۔ پٹھان کا دوا میں اثر۔''

''تم نے پہلے کبھی کسی کا علاج کیا ہے؟''

''بے شمار۔ بے شمار مخلوق کا۔ امارا دوا غلط نکلا تو ام کو خان تق تق زئی مئیں ٹن ٹن زئی بولو۔''

''میرے ساتھ آؤ، لیکن یاد رکھو، اگر تم دھوکے باز دوا فروشوں میں سے نکلے تو تمہارا بہت برا حشر ہوگا۔''

''حشر قیامت کا روز ہوگا، برادر، مگر خان کا دوا جھوٹا نئیں۔''

خوبصورت آدمی اب دوسرے کسی قدر کم روشن کمرے میں داخل ہو گیا، جو اندر سے ٹھنڈا ٹھنڈا سا تھا۔

''تم... تم ہر قسم کا علاج کر سکتے ہو؟''

Akram Allahabadi

''ام تمارا مطلب سمجھا۔تم کو شرم لگتا۔ٹیک ہے ٹیک ہے ۔و لے وائی سے پیٹ مئیں چھپایا جا تا ۔خان سے نا مردی مئیں چھپایا جا تا ۔''

''چپ رہو۔'' وہ اس جملے پر اک دم بگڑ گیا۔

''اچا...اچا...تم بولو،مگر ایک شرط ہے۔''

''کیا ہے؟''اس نے برا سا منہ بنا کر پوچھا۔

''تمارا کام تمام ہوا،یعنی کہ پورا ہوا تو ام دو ہزار روپیہ سکہ رائج الوقت لے گا۔''

''ملے گا اور بھی بہت سا ملے گا۔''

''تو بسم اللہ۔''

''جواب میں پہلے اس آدمی نے کمرے کے تمام دروازے،کھڑکیاں بند کردیں اور پٹھان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''تم ام کو اِدر بند کر کے ماریگا تو تم پر خدا کا غضب ٹوٹیگا۔''پٹھان خوفزدہ سا نظر آنے لگا۔

''ڈرو نہیں،میں تمہیں اپنا مرض دکھانا چاہتا ہوں۔''

☆☆☆☆☆☆

کمرے کا دروازہ پانچ منٹ کے بعد کھلا اور وہ دونوں باہر نکل آئے۔وہ پٹھان سے چلتے چلتے کہہ رہا تھا۔

''میں سینکڑوں علاج کرا چکا ہوں،لیکن ابھی تک کسی سے فائدہ نہیں ہوا۔''

''اللہ اپنا فضل کرے گا،گھبراؤ مت۔''پٹھان ایک تھیلی کھولتے ہوئے کہنے لگا۔

''ام تمارا واسطے ایک لاجواب دوا بنائے گا،مگر تم ام کو ایک الگ کمرہ دو۔'' پٹھان نے کہا اور اس نے فوراً اس چھوٹے سر والے کو بلا کر اسے اشاروں میں حکم دیا کہ دوا دارو خان کو

Akram Allahabadi

علیحدہ کمرے میں لے جائے۔

اس کے بعد اس نے اپنا کمرہ بند کر لیا۔ چھوٹے سر کے آدمی نے پٹھان کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور وہ تین کمروں سے گزر کر راہداری کو طے کرتا ہوا کوٹھی کے دوسرے سرے پر ایک کونے کی کوٹھڑی کے پاس جا کر ٹھہر گیا۔ اس نے اس کا دروازہ کھول دیا اور پٹھان کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ پٹھان کے اندر داخل ہوتے ہی اس کا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔ یہ خاصہ آراستہ کمرہ تھا اور یہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ حتٰے کہ پانی کی ایک صراحی بھی، لیکن یہ اب تک پٹھان کی سمجھ میں بھی نہ آسکا کہ وہ اس وقت ہے کس مقام پر۔ کھڑکیوں سے باہر بھی اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ کمرے میں روشنی کرنے کے بعد وہ فرش پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ پھر اس نے اپنی جھولی میں ہاتھ ڈال کر ایک تقریباً ۱۲ انچ لمبا، چار انچ چوڑا سیاہ رنگ کا ڈبہ نکالا۔ یہ دراصل ایک مخصوص قسم کا کمیونیکیٹر تھا جو بیٹری سسٹم پر لاسلکی پیغام جاری اور وصول کرتا تھا۔ وہ اس کی راڈ باہر کر کے سوئچ آن کرنے کے بعد مدھم آواز میں کسی کو کال کرنے لگا۔

''ہیلو، سارجنٹ بالے کالنگ۔'' اس نے کہا۔ ''بالے کالنگ ایچ کے۔'' تین چار بار کال کرنے کے بعد جو جواب اسے ملا وہ شاید مایوس کن تھا، کیونکہ دوسری طرف سے اسے سنائی دینے والی آواز نے کہا تھا کہ ایچ کے کل سے پتہ نہیں ہے۔ اس نے جھنجلا کر سیٹ پھر سے بند کر دیا۔ اور اسے جھولے میں ڈالنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک کھڑکی کے راستے سے ایک فائر ہوا اور وہ سیٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا، کمرے کی کھڑکی میں کسی کا سایہ نظر آرہا تھا۔

''خبردار جو اپنی جگہ سے ہلے۔''

''اوئے، تم کون ہے، برادر؟ تم پٹان کو ستائیگا، پروردگار تم پر چٹان گرائے گا۔''

لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ صرف پستول کی نالی کا رخ اس کی طرف قائم رہا۔ اسی وقت ایک جھٹکے کی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور وہی چھوٹے قد کا آدمی

اندر گھس آیا۔اس کی خوفناک آنکھیں اس وقت وقت دہکتے انگاروں کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔اس نے کسی دیو کی طرح جھوم کر قدم بڑھائے اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بالے کی گردن دبوچنے کے لیے جیسے ہی جھپٹا، بالے بجلی جیسی تیزی سے ایک طرف ہٹ گیا اور وہ جھونک میں فرش پر اوندھا جا گرا۔بالے نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے خود اس پر جست لگا دی، ورنہ کھڑکی سے چلائی جانے والی گولی اس کے سینے سے گزر جاتی۔چھوٹے سر کا آدمی طاقت اور جسامت میں اس سے کم از کم چار گنا زیادہ رہا ہوگا، لیکن بالے بالے کا پھرتیلا جسم آسانی سے اس کے قابو میں آنے والا نہیں تھا۔کچھ دیر تو وہ فرش پر اسی طرح لڑھکتے رہے۔پھر ان میں گھونسے بازی شروع ہوگئی اور اس فن میں بالے کو مہارت حاصل تھی۔اس نے ایک ہی گھونسے میں چھوٹے سر کے آدمی کو داڑھ پکڑ لینے پر مجبور کر دیا۔پھر اس نے اپنا گھٹنا اس زور سے چھوٹے سر والے کے پیٹ میں مارا کہ وہ داڑھ کو چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ کر جھک گیا اور اوپر سے اس کی پیٹھ پر پڑنے والے بالے کے دو ٹھوکر نے اسے فرش پر پھر اوندھا کر دیا۔

''اچھا اب اپنے ہاتھ اٹھا دو۔''اب کی بار یہ آواز اسے دروازے کی طرف سے سنائی دی۔

وہ سایہ اتنی دیر میں کھڑکی چھوڑ کر دروزے پر آچکا تھا۔پستول کی زد میں رہ کر مجبوراً بالے کو دونوں ہاتھ اٹھا دینے پڑے۔اسے اس عالم میں دیکھ کر چھوٹے سر کا آدمی فرش سے اٹھ کر پھر اس پر جھپٹا، لیکن اس بار خود اس کے مالک نے اسے روک دیا۔

''اس سے بعد میں سمجھ لیں گے، سر دست اسے بند کر دو یہیں۔''یہ کہہ کر اس نے پستول کے نشانے پر بالے کو رسی میں جکڑوا دیا۔پھر وہ کمرے کی کھڑکیاں اور دروازہ بند کر کے اسے باہر سے مقفل کر کے چلے گئے۔

☆☆☆☆☆☆

قانون کا ہاتھ

رات آدھی ہو چکی تھی، جب روشندان سے گزر کر کسی کی دردناک چیخ بالے کے کانوں سے ٹکرائی۔ اب تک تو وہ راضی برضائے حالات چل رہا تھا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہاں سے آسانی سے فرار ناممکن ہے۔ اور پھر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اس مقام پر ان کے علاوہ کوئی زنانہ ہستی بھی موجود ہے، ورنہ شاید وہ اتنی آسانی سے یہاں نہ رکھا جا سکتا۔

اسے جیسے کوئی چیز یاد آ گئی۔ وہ چند حقیر سے باریک آلات، جو ہر ایسے نازک موقع پر استعمال کے لیے اپنے پاس رکھتا تھا۔ وہ اس وقت بھی جھوے میں موجود تھے۔ اس نے اندر ہاتھ ڈال کر کچھ دیر ٹٹول کر اندر سے ایک باریک سی آری نکالی اور پھر ایک سیال سی چیز چھوٹی سی شیشی سے نکال کر مٹھی میں لے لی۔ ایک کرسی پر دوسری کرسی رکھ کر وہ اس اونچائی کی مدد سے کمرے کے باہر کی سمت والے روشندان تک پہنچ گیا۔ یہاں اس نے وہ شیشی نکال کر اس نے سیال مادہ دو سلاخوں کی جڑ میں انڈیل دیا۔ لوہے کی سلاخیں اس کے پڑتے ہی اس طرح سلگ اٹھیں، جس طرح جلتے ہوئے توے پر پانی پڑ جائے۔ سنسناہٹ کی آواز کے ساتھ سلاخوں سے دھواں نکلنے لگا اور اس پر جب آری چلائی گئی تو فولادی سلاخیں موم کی طرح کٹ گئیں۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں کی طاقت سے ان سلاخوں کو موڑ کر اونچا کر دیا اور روشندان سے گزر کر باہر نکل گیا۔

آواز یقیناً عمارت کے اندر سے آئی تھی۔ اس نے اندرونی جیب سے بھرا ہوا پستول نکال لیا اور دبے قدم رکھتا ہوا راہداری میں گزرنے لگا۔ اب اس کے قدم ایک ایسے کمرے کے فرش پر چل رہے تھے، جس کا دروازہ شاید اتفاق سے کھلا رہ گیا۔ ادھر اندر کی سن گن لینے کے بعد وہ پراسرار گونگا چھوٹے سر والا بھی اس وقت کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مگر

بالے کو اس کی خبر بھی نہ تھی۔اس کمرے سے گزر کر وہ جس دروازے پر پہنچا اس کے اندر سے روشنی آ رہی تھی۔دروازہ بند تھا۔وہ تیزی سے اس کی پشت والی کھڑکی کی طرف دوڑا اور جب اس نے پوری طاقت سے کھڑکی کو دھکیل کر کھولا تو سامنے کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔وہ خونی درندہ ایک خوفزدہ لڑکی کے سامنے کھڑا قہقہے لگا رہا تھا۔

''خبردار۔'' بالے کے منہ سے گرجدار آواز نکلی، لیکن جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ اس وقت وہ ایسی کیفیت میں تھا جسے جنون کی حد سے بھی گزری ہوئی کہا جا سکے۔اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔اس کے سامنے خوف سے تھر تھر کانپتی ہوئی پھول کھڑی تھی۔اس کے سر کے بال کھچے ہوئے تھے۔فراک کاندھوں سے پھٹ چکی تھی، لیکن نچلا لباس اب تک سلامت تھا۔وہ اب تک شاید تمام کمرے میں بھاگی بھاگی پھرتی رہی تھی، کیونکہ اس وقت اس خونخوار انسان نے اس کا راستہ روک لیا تھا اور وہ خوفزدہ بے بس ہو گئی تھی۔بالے کی آواز تو اس کے کان میں ہی نہیں پڑی۔وہ اس بے بس لڑکی کو بھوکے بھیڑیے کی طرح گھور رہا تھا۔ایسا بھیڑیا جس کی بھوک کبھی نہ مٹ سکی ہو۔اور وہ کسی عقاب کے زیرِ سایہ سمٹی ہوئی ننھی سی چڑیا کی طرح تھر تھر کانپنے لگی تھی۔اس کی نگاہیں بار بار دروازے کی طرف جاتیں اور پھر اس کے چہرے پر۔بالے نے پستول کے دستے سے کھڑکی کا شیشہ توڑ ڈالا اور چاہتا ہی تھا کہ ہاتھ اندر ڈال کر فائر کرے، لیکن اسی وقت پشت سے کوئی چیز اچھل کر اس پر آ گری۔وہ کھڑکی سے لڑھک کر نیچے آ رہا۔اس کی گردن چھوٹے سر والے گونگے کی مضبوط گرفت میں تھی۔اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔اس نے بہت کوشش کی کہ اس کے مضبوط بازو سے اپنی گردن آزاد کرا لے، لیکن وہ جس قدر زور لگاتا گیا، گونگے کی گرفت اتنی ہی سخت ہوتی گئی۔بالے کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا اور اسے اپنی طاقت جواب دیتی معلوم ہونے لگی، مگر ٹھیک اسی وقت کہیں سے ایک فائر ہوا اور ایک جھٹکے کے ساتھ چھوٹے سر والے گونگے کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔وہ لڑکھڑا کا نیچے گر پڑا۔ساتھ ہی بالے کو کسی کے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔کوئی

انسانی سایہ اسی طرف آ رہا تھا۔ یہ سب کچھ چشمِ زدن میں ہوگیا۔ فائرنگ کی آواز کے ساتھ ہی اچانک اس کمرے میں بھی اندھیرا ہوگیا، جس میں بربریت کا وہ خوفناک کھیل کھیلا جا رہا تھا۔

''تم جلدی سے اس طرف سے دوڑو۔ اب وہ اکیلا ہی ہے۔'' آنے والے نے بالے کا بازو تھام کر اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ آواز سپرنٹنڈنٹ خان ہی کی تھی، لیکن حلیہ عجیب تھا۔ وہ ایک بوڑھا آدمی نظر آ رہا تھا، جس نے جسم پر معمولی کپڑوں کے علاوہ ایک شیروانی بھی پہن رکھی تھی۔

بالے فوراً ہی سنبھل گیا۔ وہ اس کی ہدایت کے مطابق اس کمرے کے داہنی سمت والی راہداری کی طرف دوڑنے لگا اور خان آگے نکل گیا۔ ان کی جیبوں میں ٹارچز بھی تھیں، جن کی مدد سے انھوں نے پوری عمارت چھان ماری، لیکن اس پراسرار وجود کا کہیں پتہ نہ چلا۔ وہ لڑکی بھی اس کمرے سے غائب تھی اور خان خاص طور پر اس کے لیے زیادہ فکرمند نظر آ رہا تھا۔

''آپ کچھ گھبرائے ہوئے ہیں؟'' بالے پوچھ ہی بیٹھا۔

''مجھے نرگس کی فکر ہے، کہیں وہ اسے اپنے جنون کا نشانہ نہ بنا ڈالے۔'' خان نے کہا۔

''تو کیا وہ لڑکی نرگس...؟''

''ہاں۔ اس کام کے لیے مجھے اس سے موزوں کوئی ساتھی نہیں مل سکا تھا۔'' خان نے پچھلے دالان میں چلتے ہوئے جواب دیا۔ پھر آپ سے آپ وہ اس زینے کو دیکھ کر چونک پڑا۔

''ہم نے اس کے اوپر تک جا کر تو دیکھا ہی نہیں۔'' یہ کہتا ہوا وہ دوڑ کر اوپر چڑھنے لگا۔ بالے اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ مگر جس وقت وہ چھت پر پہنچے تو چھت کے ایک کونے پر بنی ہوئی بڑی گیرج نما کوٹھڑی کے بڑے دروازے کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ خان کے قدم دوڑتے دوڑتے رک گئے۔

''کیوں؟'' بالے نے حیرت سے پوچھا۔

''نکل گیا سور، لیکن نرگس؟'' خان پریشان ہوگیا۔ جس نے اس کی حفاظت کا اس سے وعدہ کیا تھا۔

''تو کیا چھت سے کود پڑا؟''

''گدھے، دیکھتے نہیں، یہ ہیلی کاپٹر کا گیراج ہے اور وہ تمام لاشیں اس مردود نے ڈونگرا جھیل میں ہیلی کاپٹر سے ٹپکائی ہیں۔''

''باپ رے، مگر یہ ہے کون؟''

''یہ ان باتوں کا وقت نہیں، تم یہیں ٹھہر کر اس گونگے کی خبر لو کہ مرا، یا ابھی زندہ ہے۔ میں اسے دیکھتا ہوں۔'' خان یہ کہہ کر نیچے کی طرف دوڑا۔

''مگر کس طرح دیکھیں گے آپ اسے؟'' بالے نے بھی پیچھے پیچھے زینے سے اترتے ہوئے پوچھا۔

''یہ بھی تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس طرف لے گیا ہے اسے۔ رات اتنی اندھیری ہے کہ اونچی پرواز میں ہیلی کاپٹر کا نظر آنا بھی مشکل ہے۔'' خان بڑبڑاتا گیا۔

''اس کا انتظام آپ کو پہلے سے کرنا چاہیے تھا۔''

''صرف آج ہی تو اس کمبخت کے اس مقام کا پتہ چل سکا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ اگر وہ جان بچانا چاہتا ہے تو ایروڈروم کی طرف جائے گا۔''

''وہ اس وقت اندھا ہو رہا ہے، اس کا کوئی بھروسہ نہیں۔'' یہ کہتا ہوا خان نیچے آ گیا۔ بالے کو چھوڑ کر وہ باہر کی طرف دوڑا۔ عمارت کے احاطے کے دروازے پر باغِ نشاط کی تختی لگی ہوئی تھی۔ خان کی کار باہر موجود تھی۔ اس نے اپنی گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے اندھا دھند ڈرائیو کرنے لگا۔ اس وقت اس پر بھی کچھ عجیب سا جنون سوار تھا۔ اس کی کار رخ شہر کی طرف تھا۔ بمشکل ۲۵ منٹ ہی گزرے ہونگے کہ اس کی کار شہر میں داخل ہو چکی تھی اور اب وہ

کلکرنی روڈ پر گھوم رہی تھی۔ پھر اس نے تیز رفتاری سے اپنی کار سرگزدر کے بنگلے، رین بو، کے احاطے میں داخل کر دی اور دربان گاڑی کی زد میں آتے آتے اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ خان نے گاڑی پورٹیکو میں روک دی اور خود گاڑی سے اتر کر تیزی سے بنگلے میں داخل ہو گیا۔ سر گزدر کا سکریٹری اسے دروازے کے اندر ہی مل گیا۔

''اوہو، بڑے میاں! اکیلے ہی آ رہے ہو؟'' سکریٹری نے خود ہی اسے ٹوک دیا۔

''کیوں؟ کیا پھول نہیں آئی یہاں؟'' خان نے لہجہ بدل کر اس سے دریافت کیا۔

''کہاں؟ وہ تو تمہارے ہی ساتھ گئی تھی نا، سرگزدر کی مضافاتی کوٹھی میں۔'' اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''تمہیں معلوم ہے وہ کوٹھی؟''

''شہر کے کنارے لکھن پورے میں ہی تو ہے۔ کیوں وہاں تک نہیں پہنچے کیا؟'' سکریٹری نے پوچھا۔

''اور بھی کوئی کوٹھی ہے کیا؟''

''رئیس آدمی ہیں، ان کا کیا۔ نہ جانے کتنی کوٹھیاں اور باغات ہیں ان کے، مگر مجھے نہیں معلوم۔''

سکریٹری یہ کہہ کر برا سا منہ بناتا ہوا اندر چلا گیا۔ خان نے یہ یقین کر لینے کے بعد کہ سرگزدر بنگلے میں موجود نہیں محتاط نظروں سے پہلے چاروں طرف دیکھا، پھر وہ جلدی سے لوٹ کر اپنی کار پر آ گیا۔ یہاں بھی اس وقت کوئی موجود نہ تھا۔ خان نے ڈیش بورڈ میں نصب کیا ہوا کمیونیکیٹر آن کر کے علاقے کی وائرلیس پٹرولنگ فورس کو فوراً رین بو پر طلب کر لیا اور خود بنگلے کی دیوار کے سائے میں چلتا ہوا احاطے کے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔

وائرلیس پٹرولنگ فورس کو رین بو تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ پولیس کے سائرن نے رین بو کے آس پاس کے مکینوں کو چونکا دیا۔ لوگ اپنے کمروں کی کھڑکیاں کھول کر

باہر جھانکنے لگے۔دربان تو پولیس کی گاڑیاں دیکھتے ہی سٹپٹا گیا۔خان سائرن سن کر سامنے کے حصے کی طرف آگیا۔پٹرولنگ فورس کا اس علاقے کا انچارج انسپکٹر رنبیر اس کے سامنے اٹینشن ہو گیا۔

''دو آدمی اس طرف ٹھہر کر باقی میرے ساتھ آیئے اور یہاں کسی قسم کا شور نہ ہو پائے۔''خان نے انھیں ہدایت کی۔

اس نے باقی آدمیوں کو احاطے کے پچھلے حصے کے تاریکی میں چاروں طرف بکھیر دیا۔وہ جو کچھ کر رہا تھا،محض اندازے اور امکان کے سہارے،مگر اس کی قوت ارادی اس قدر مضبوط تھی کہ اس کے اندازے اور اس کا طریقِ عمل مشکل ہی سے کبھی غلط ثابت ہوتا۔

بمشکل پانچ منٹ اور انھیں انتظار کرتے گزرے جب پرواز کرتے ہوئے کسی بڑے پرند کے پروں کی شائیں شائیں جیسی آواز نے انھیں چونکا دیا۔وہ خان کا اشارہ پاتے ہی چاروں طرف سے پیچھے ہٹ کر اندھیرے میں چھپ گئے۔اور پھر ان کی آنکھوں نے اس خاموش اندھیرے میں ایک ہیلی کاپٹر کو احاطے کے پچھلے حصے میں اترتے دیکھا۔اس میں دو سائے نظر آرہے تھے۔ایک کی گردن لڑھکی ہوئی تھی اور دوسرا جو ڈرائیو کر رہا تھا۔

ہیلی کاپٹر کے زمین پر اترتے ہی اس کے اندر بیٹھا ہوا آدمی پہلے اترا پھر اس نے دوسرے سائے کو،جو بیہوش یا مردہ معلوم ہوتا تھا،اٹھا کر کاندھے پر لادا۔لیکن فوراً ہی کئی تمتماتی ہوئی ٹارچوں کی روشنیاں اس کے چہرے پر پڑیں اور وہ سکتے میں رہ گیا۔اسے پولیس نے گھیر لیا تھا۔خان پہلے آگے بڑھا۔وہ اس سائے کے ہاتھ میں پستول دیکھ چکا تھا۔

''سرگزدر،سرگزدر،مجھے بچایئے۔مجھے پولیس نے گھیر رکھا ہے۔''وہ چیختا ہوا اس کے نزدیک پہنچ گیا۔پھول کا بوڑھا باپ سمجھ کر سرگزدر کی انگلی پستول کے ٹرائیگر پر نہ دب سکی اور دوسرے لمحے خان کا ایک گھونسہ کھا کر وہ زمین پر پڑا تھا اور پستول دور اندھیرے میں۔

☆☆☆☆☆☆

باغِ نشاط کی عمارت کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد اس رات خان اور بالے دو بجے واپس لوٹے۔ باغِ نشاط کی پراسرار خوفناک شخصیت کا راز تو اسی وقت منکشف ہو چکا تھا، جب خان نے پولیس ہیڈ کوارٹرز میں اسے لا کر اس کا منہ گرم پانی سے دھلوانے کے بعد میک اپ کی باریک سی جھلی اس کے چہرے سے اتاری۔ اس کے بعد سرگزدر نے ان تمام کیسز کا خود اقبال کر لیا۔ اس وقت وہ اپنی صحیح ذہنی کیفیت میں تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ یکے بعد دیگرے تمام وارداتوں کا اقبال کرتا گیا۔ اس نے بتایا کہ کیپٹن بوس کے میک اپ میں بھی وہی تھا۔ اور اس طرح اس نے مختلف شخصیتوں میں خود کو بدل کر ان لڑکیوں کو اپنا گرویدہ بنایا تھا جو اسے پسند آئی تھیں۔ وہ ان کو پیار کرنا چاہتا تھا، لیکن زندگی کی ایک بہت بڑی غلطی ہمیشہ اسے ایسے موقعوں پر پاگل کر دیا کرتی تھی۔ اور وہ یہ سمجھ کر کہ سامنے ہوتے ہوئے بھی وہ ان سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت سے محروم ہے، جذباتی طور پر اس قدر مشتعل ہو جاتا تھا کہ وہ اپنے لیے نہیں تو کسی کے لیے نہیں کے خود غرضانہ احساس کے تحت بربریت کا بدترین اقدام کر بیٹھتا۔ اسے ایسے موقعوں پر اپنے آپ پر بالکل قابو نہیں رہ جاتا تھا۔ اس نے بتایا کہ گونگا اس کا بہت پرانا اور وفادار نوکر تھا، جسے وہ کلکتے سے لایا تھا۔ اس نے خان کی ایڈوانس اور خفیہ رپورٹ کے عین مطابق یہ بھی قبول کر دیا کہ وہ تیزاب اور کاسٹک سے سڑائے گئے پانی میں ان لاشوں کو ڈبونے کے بعد ہیلی کاپٹر کے ذریعے جھیل ڈونگرا میں لے جا کر اوپر سے ایک رسی کے ذریعے نیچے لٹکا کر پانی میں اتنی آہستگی سے چھوڑ دیا کرتا تھا کہ آواز تک نہ ہوتی۔ اور حوض میں ڈبوئے جانے کی وجہ سے یہ لاشیں بہت جلدی سڑ جایا کرتی تھیں۔ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر یہ لاشیں پانی میں ہی گل نہ جائیں تو کوئی بھی یہ اندازہ نہ کر سکے کہ قتل ہے یا خودکشی اور یہ کہ وہ کتنی مدت کی لاش ہے۔''

اس نے لفظ بہ لفظ وہی بیانات دیے جن کی خفیہ رپورٹ اس کی گرفتاری سے پہلے

خان نے پولیس کمشنر کو دے چکا تھا۔اور اسی رپورٹ کے بر۔تے پر اس نے سرگز در کی گرفتاری کا وارنٹ حاصل کرنے کی دوبارہ کوشش کی تھی ۔

سرگز در سوسائٹی کے کا معزز ترین آدمی...اور اتنا خوفناک مجرم ۔یہ تہلکہ خیز انکشاف عوام کے کانوں تک پہنچنے کے لیے اس وقت کا منتظر تھا جب اخبار والے بھی سرخیوں میں جھیل ڈونگرا کے اسرار کی تہلکہ خیز کہانی صحیح صحیح شائع کریں گے۔

''لیکن آپ کو سرگز در پر شبہ کیسے ہوا؟''بالے نے پوچھا۔

''نفسیات، جنسیات اور جلدی امراض کے مختلف ماہرین سے ملنے کے بعد ایک ایسی شخصیت کا علم مجھے ہو چکا تھا جو پراسرار طریقوں پر ان سے مل کر اپنی کمزوری کا علاج کرا چکی تھی، مگر پھر اس کی سرگرمیاں اکدم رک گئیں ۔حالانکہ ایسے لوگ کبھی مایوس نہیں ہوتے ۔ان ہی دنوں سرگز در غیر ممالک کے دورے پر گئے ۔وہاں انھوں نے اسکاٹ لینڈ میں اسٹیج اداکری کا خود کو شوقین ظاہر کر کے پلاسٹک سرجری اور جھلی کا میک اپ سیکھا ۔وہ وہاں بھی یقیناً کئی ماہرینِ نفسیات و جنسیات سے ملے ہوں گے۔''

''آپ کو یہ اطلاعات کہاں سے فراہم ہوئیں؟''

''بڑی آسانی سے ۔شاید تمھیں نہیں معلوم کہ اس سفر میں مسٹر دینا ناتھ رائے بھی ان کے ساتھ تھے ۔میں نے ان سے ہی سب کچھ معلوم کیا۔''

''عجیب بات ہے۔''

''کچھ عجیب نہیں ۔صرف دماغ صرف کرنے کی ضرورت تھی ۔تم ماؤنٹ بیری والے واقع کے دن یہ بھول گئے تھے کہ اس کار کے فرار ہونے کے بعد تمھیں جب اپنی موٹر سائیکل کا پچھلا ٹائر بیکار ملا تو وہاں سوائے بیہوش پڑے ہوئے کیپٹن بوس کے اور کوئی نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ بیہوش رہا نہ ہوگا، صرف بن گیا ہوگا۔''خان نے اپنی کار سے اتر کر بنگلے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"مگر وہ آدمی جس نے اس پر حملہ کیا تھا اور سیتا کو لے کر بھا گا تھا؟" بالے نے پوچھا۔

"وہ...وہی چھوٹے سر والا گونگا تھا۔ اس رات اس نے فیلٹ ہیٹ لگا رکھی ہوگی۔"

"میرے تو فرشتے بھی یہ نہ سوچ سکے۔"

"تمہارے فرشتے افیون کھاتے ہوں گے۔ خیر، تو میں نے سب سے پہلے کیپٹن بوس کو تلاش کرنا شروع کیا اور میرا شبہ بالکل صحیح نکلا کہ اس نام کا کوئی آدمی مجھے نہیں ملا۔ چنانچہ میں نے بوس کے بارے میں اکیلے میں دینا ناتھ رائے سے پوچھا اور میں اس وقت یہ جان کر حیران رہ گیا کہ کیپٹن بوس کو وہ خود نہ جانتے تھے، بلکہ چند دن قبل سر گز در نے ایک تعارفی خط دے کر اسے مسٹر رائے کے پاس بھیجا تھا۔ یا دوسرے الفاظ میں خود سر گز در اپنا تعارفی خط لے کر ان کے پاس کپتان بوس کی حیثیت سے آیا تھا۔ اسے سیتا سے دلچسپی تھی اور سیتا سر گز در کو چچا کہتی تھی۔"

"بڑا کمینہ تھا سور۔"

"گالیاں دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"اچھا تو پھر؟" بالے نے خان کے پیچھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"پھر یہ کہ میں نے سر گز در پر نظر رکھنی شروع کی۔ وہ انتہائی چالاک تھا کہ کہیں سے شبے کا موقعہ ہی نہ دیتا تھا، کہ اس مرض اور اس بربریت کا راز صرف ایک ہی شخصیت تھی۔"

"یعنی وہ گونگا؟" بالے بول پڑا۔

"ہُم۔ اور کسی تیسرے کو اس کا شبہ تک نہ ہو سکتا تھا۔"

"چلیے یہ الف لیلے تو ختم ہوئی، لیکن آخر سارے فساد کی جڑ یہ بیماری کون سی تھی؟"

"اسے راز ہی رہنے دو۔ سمجھنے کے لیے اسی قدر اشارے کافی ہیں۔ ویسے اس کی تفصیلات یا تو مجھے معلوم ہیں یا سول سرجن کو۔"

"تو آپ دونوں کو بھی وہی بیماری ہوگی۔" بالے برا سا منہ بنا کر یہ کہتا ہوا صوفے پر

Akram Allahabadi

بیٹھ ہی رہا تھا کہ پشت پر پڑنے والی خان کی ایک لات نے اسے صوفے پر اوندھا گرا دیا۔

☆☆☆ ختم شد ☆☆☆

Akram Allahabadi